دوسرا ترجمہ نہ کرسکیں گے، لائق مؤلف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ طالب علم کو صرف و نحو اس وقت شروع کرانی چاہئے، جب طالب علم لکھ پڑھ اور بول سکتا ہو، کیونکہ گرامر کا وجود زبان کے بعد ہوتا ہے" ان ابتدائی ریڈرون کی تعلیم کی حد تک جس کا مقصد صرف حفظ لغات ہوتا ہے، یہ خیال صحیح ہوسکتا ہے، لیکن ترجمہ اور انشا، تو گرامر کی مدد کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے، خود انگریزی تعلیم مین بھی جسے پروفیسر صاحب نے اپنے دعوی کے ثبوت مین پیش کیا ہے، ٹرانسلیشن اور گرامر ساتھ ساتھ چلتی ہے، گرامر کے زبان کے بعد وجود میں آنے کو تعلیم سے کیا علاقہ؟ اس کا تعلق تو زبان کی ابتدائی تاریخ سے ہے، اگر اس اصول کو کسی حد تک مانا بھی جاسکتا ہے، تو صرف اہل زبان کے لئے، غیر زبان کو بغیر گرامر کی مدد کے لکھنا ممکن ہی نہیں ہے، پروفیسر صاحب کا یہ خیال کہ صرف و نحو کی جتنی کتابین ہمارے یہان مروج ہین، تمامتر ایرانی یا ہندی علما، کی لکھی ہوئی ہین، جو عربی زبان سے پوری طرح آشنا نہ تھے، (اس لئے ناقابلِ اعتماد ہین) ....یا آجکل کے ہندی علما، کی کوئی قابل اعتماد تصنیف نہین پائی جاتی، یا اس قسم کے دوسرے پریشان خیالات ان کے "تازہ ولایت" ہونے کا نتیجہ ہین، اس پر طرہ یہ ہوا کہ آتے ہی ان کو ایک جوہر شناس اور قدردان سرزمین ملی، اس لئے ان کو ہندیون کی عربی سطح پست نظر آئی، لیکن امید ہے کہ کچھ دنون ہندوستان کی ہوا کھانے یہان کے اہلِ علم سے ملنے اور ان کی عربی تصانیف کے مطالعہ کے بعد جس کا غالباً ابھی انھین موقع نہین ملا ہے، ان کے خیالات مین بہت کچھ سکون ہوجائے گا،

دودھ کی قیمت منشی پریم چند تقطیع بڑی ضخامت ۱۵۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت: ۱۲؍

پتہ: عصمت بک ڈپو دہلی،

یہ کتاب منشی پریم چند کے نو افسانون کا مجموعہ ہے، جو رسالہ عصمت دہلی مین شائع ہوئے تھے، منشی پریم چند کے افسانون کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، مصنف کی افسانہ نگاری کی تمام ظاہری و معنوی خصوصیات ان مین موجود ہین، افسانے اخلاقی و اصلاحی اور معاشرت کے مختلف پہلوؤن کی نہایت صحیح تصویرین ہین، زبان نہایت شیرین اور خیالات پاکیزہ ہین،

"م"

جلد ۵۱ ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۶۲ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۴۳ء عدد ۶

مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	سید سلیمان ندوی،	۴۰۲-۴۰۴
اسلامی معاشیات کا ایک باب،	مولنٰنا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ،	۴۰۵-۴۲۳
میر کا فارسی کلام،	جناب محمد ابواللیث صاحب صدیقی ایم اے علیگ لکچرار شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈہ،	۴۲۴-۴۳۱
مہابت خاں کا باغ اور مقبرہ،	جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے لاہور،	۴۳۲-۴۴۱
استدراکات بر مقالہ صفی ہندی،	ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاذ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن و مولنٰنا بدر الدین صاحب علوی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈہ،	۴۴۲-۴۴۵
سلطان شہاب الدین کے قاتل ہقتل، مرقد اور چند دوسرے استفسارات،	"ز"	۴۴۶-۴۶۷
استفتا از حضرات علمائے کرام،	مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب ریٹائرڈ کلکٹر	۴۶۸-۴۷۴
شاطر مرحوم،	"س"	۴۷۵-۴۷۶
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۴۷۷-۴۸۰

شذرات

رسائل کی دنیا میں معارف کے بہت سے اوّلیات ہیں، جن میں سے ایک رسالہ کے مضامین کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنا ہے، اور اس میں بھی اس سے پہلے اس کے دو دور گذرے ہیں، پہلا ۱۹۱۶ء سے اپریل ۱۹۱۹ء تک، اور دوسرا ۱۹۱۹ء سے اس وقت تک کہ ۱۹۴۳ء ہے، پہلے دور میں اس کے ابواب شذرات، مقالات، تقریظ و انتقاد، آثارِ علمیہ ادبیہ، تراجم، مسائل و فتاویٰ، ادبیات اور مطبوعات تھے، ۱۹۱۹ء میں ہمارے دوست مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے معارف کی ادارت میں شرکت فرما کر شذرات کو بہت بڑھا دیا، یعنی اس میں ہر قسم کے مسائل پر اظہارِ خیال کی طرح ڈالی، اور ساتھ تلخیص و تبصرہ کا ایک باب بڑھایا، جس میں مشہور انگریزی رسالوں کے مضامین کا خلاصہ ہونے لگا، اور اخبارِ علمیہ کا دوسرا باب اضافہ کیا، اور رسالہ اسی ترتیب پر اب تک نکلتا رہا،

———— ❋ ————

رسالہ کی یہ ترتیب بعض اہلِ ذوق کو ایسی پسند آئی کہ اس کی تقلید شروع ہو گئی، اور معارف کے امتیاز میں اشتراک کا عیب پیدا ہو گیا، اسی وقت سے جی چاہ رہا تھا کہ اس میں کوئی تغیر کیا جائے، اتفاق یہ کہ جنگ کی وجہ سے انگلینڈ، امریکہ اور مصر کے رسائل کی آمد بند سی ہو گئی، تاہم اس وقت تک اس ترتیب کو چلایا جاتا رہا، لیکن پیش پا افتادہ مضامین کی تلخیص اور اخبارِ علمیہ کی تراوش آمد کے بجائے آورد ہوتی جارہی ہے، اس لئے اس ترتیب میں کچھ ادل بدل مناسب معلوم ہوا،

دار المصنفین میں اطرافِ ملک سے علمی سوالات اکثر آتے رہتے ہیں اور ان کے جوابات جاتے رہتے ہیں، اب اس خیال سے کہ ہمارے رفقار کی یہ محنت جو جوابوں پر صرف ہوتی ہے بیکار کیوں جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان جوابات میں سے جو ایسے ہوں جن میں عموم فائدہ کا پہلو ہو، معارف میں وقتاً فوقتاً شائع کئے جاتے ہیں، اسی لئے پچھلے پرچہ سے سوال وجواب کا باب بڑھا دیا گیا ہے، اور اخبارِ علمیہ اور تلخیص کا باب بند نہیں کیا جاتا، لیکن التزام ترک کیا جاتا ہے،

————

ہمارے ایک لائق دوست ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی (دکن کالج پونہ) اپنے ایک عنایت نامہ میں لکھتے ہیں:-

آپ بعض اوقات بہت سے اہم واقعات کو شذرات میں مختصر المعنی فی بطن الشاعر رکھ کر درج کرتے ہیں، یاد رہے کہ آپ کے بعد لوگوں کو تکلیف ہوگی جب لوگ ان کے تحت تلاش سے کام لیں گے، اس لئے میری ناقص رائے میں آپ کو ان عنوانات کے تحت مفصل لکھنا چاہئے، ہماری تاریخ آگے ہی سے تشنہ ہے،

———— ❋ ————

ہمارے دوست کا یہ بیان کسی قدر صحیح ہے، مگر وہ غور کریں تو پائیں گے کہ یہ اجمال کی راہ وہیں اختیار کی جاتی ہے جہاں اس کی تفصیل میں فتنہ کا خوف ہوتا ہے، ایسے موقع پر "ایمانِ مجمل" کو "ایمانِ مفصل" پر ترجیح دی جاتی ہے، اور یہ کہہ کر خموشی اختیار کی جاتی ہے کہ "اگر بخانہ کس است یک حرف بس است"

———— ❋ ————

ہمارے دوست ایک اور مشورہ دیتے ہیں:-

آپ بعض اوقات کسی عالم کی موت کا ذکر اپنے سحر بھرے الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں جنکو پڑھ کر آنکھیں آبدیدہ بھی ہوتی ہیں، اگر آپ مستند یورپی رسائل کی طرح ایک الگ موضوع وفات بنالیں تو اچھا ہے،

یہ مشورہ پسند آیا، اور اسی پرچہ سے اسکی پیروی بھی شروع کر دی گئی، اور اُسکا عنوان وفیات قرار دیا گیا

یہ بات اب چھپی نہیں کہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ذہنی انقلاب کی تڑپ پیدا ہے، حال سے بیزاری اور مستقبل کی تلاش کی کاوش اُن کی ہر فکر و عمل سے نمایاں ہے، اس وقت ان کے سامنے دو راہیں ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے ہموطن، ہم عمر اور ہم درس ہندو نوجوانوں کی صف میں کھڑے ہو جائیں جو ماضی سے بھی خفا، حال سے بیزار اور مستقبل کے لئے مضطرب ہیں، اور یا وہ اسلام کے دائرہ کے اندر رہ کر خود اسلامی تخیل اور اسلامی اعمال کا ایک ایسا خاکہ تیار کریں جو اُن کے حال کو بدل کر ان کے مستقبل کو اُن کی ماضی سے مربوط کردے،

لیکن درحقیقت یہ کام علمائے کرام کے کرنے کا ہے، لیکن چونکہ وہ اس سے تغافل برت رہے ہیں، اس لئے ان نوجوانوں میں جو لوگ تھوڑی بھی اہلیت رکھتے ہیں وہ اس کام کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دے رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ علم کامل نہ ہونے یعنی تمام پہلوؤں کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے اُن سے کہیں فہم حقیقت میں اور کہیں تعبیر میں غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، اس باب میں پھر فریقین سے فروگذاشتیں ہوتی ہیں، حضرات علماء تکفیر و تفسیق سے ان غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، اور نوجوان اپنی ضد پر اڑ کر اپنی غلطیوں کی صحت پر اصرار کرتے ہیں، اور صرف اپنی خواہش کو صحت کا معیار بناتے ہیں،

اس غلطی کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ عام طور سے ماضی و حال میں ربط دینے کے لئے تطبیق اور مصالحت کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے، لیکن اس تطبیق و مصالحت سے یہ ہوتا ہے کہ آدھی بات ادھر کی ہوتی ہے اور آدھی اُدھر کی، اس کا نتیجہ تغیر حقیقت ہے اور تاویل بعید کی وہ صورت جس کا دوسرا نام معنوی تحریف ہے، صحیح صورت یہ ہے کہ کتاب و سنت میں جو کچھ ہے اس کو بدعات و اضافات سے پاک کرکے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے عملی نمونوں کے مطابق کرکے سامنے لایا جائے، صداقت کی سادگی خود اپنے اندر کشش رکھتی ہے، تاریخی طور سے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر دور کے مجددین نے اسی راستہ سے کامیابی حاصل کی ہے، اور لوگوں کی ذہنیتوں اور عملی کیفیتوں میں تبدیلی پیدا کی ہے، غرضکہ طرز تبلیغ اور موعظت میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے،

مقالات

کتاب اسلامی معاشیات کا ایک باب

حکومت کی آمدنی اور اسکے مصارف اور اغراض

از

مولنا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ

(۳)

الغرض الصدقات کے خفیف محصول کو قبول کر لینے کے بعد اتنی قیمتی آزادی کا حصول پھر الصدقات کے نام سے مسلمانون کے مال و جائداد مویشی پر جو محصول عائد کیا گیا، وہ کوئی نئی چیز کبھی بھی نہین ہے، ہر مذہب والے اپنی آمدنی کا ایک حصہ خیر و خیرات مین صرف ہی کیا کرتے تھے، اسلام نے اسی مبہم غیر منظم خیرات کو صرف منظم اور باقاعدہ شکل مین تبدیل کر دیا، اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس تنظیم کی وجہ سے اگر نسبتہً عام خیرات سے کچھ رقم بڑھ بھی گئی ہو، جب بھی ہر قسم کے مطالبات سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سے الصدقات کے فنڈ مین جمع ہونے والے قطعًا نفع ہی مین رہتے ہین، کہان پیداوار کا نصف حصہ کہان دسوان اور بیسوان حصہ، دونون مین کوئی نسبت بھی ہے، اور اس پر لطف یہ ہے، کہ جس علاقہ کے لوگون سے لیا جاتا تھا، زیادہ تر اسکی کوشش کیجاتی تھی، کہ اسی علاقہ کے حاجتمندون مین تقسیم کر دیا جائے، جو ان اتفاقی مصائب کے شکار ہوگئے ہون، بلکہ ان کے اعزہ اقربا، خاندان والون کو جب ترجیح دیجاتی تھی، تو گویا قریب قریب الصدقات

مین شریک ہونے سے وہی غرض حاصل ہوئی جس غرض سے آدمی آج کل بیمہ کمپنیون یا انجمن ہائے تعاون باہمی مین شریک ہوتا ہے، پھر محصول عائد کرنے مین اتنی نرمیان کہ اپنے اور خاندان بھر کے روزمرہ مصارف سے بچانے اور فراغ بالی کے ایک خاص معیار کے بعد اس محصول کا مطالبہ کیا جاتا ہی، دقت رسی کے تمام اصولون محنت وجانکاہی کی تمام نزاکتون کا خیال کرتے ہوئے سال بھر کے استفادہ کا موقع دینے کے بعد اُن کو وصول کرنا اور صرف یہی نہین، بلکہ اوس کو خدا کی خوشنودی کا ایک بہترین ذریعہ قرار دینا قرآن وحدیث جن کے فضائل سے معمور ہین، اس کے بعد ملک کے ان واقعی حاجت مندون کی اعانت کا ارادہ کرکے حکومت کا اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ مین لینا، اور اپنی تمام فوجی وعسکری قوتون کو اوس کی وصولی کے لئے مختص کردینا حتی کہ ایسے خطرناک وقت مین جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عرب کے ایک بڑے حصہ مین بغاوت پھیل گئی ہو، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکومت کے خراج کے لئے نہین، جیسا کہ اکثر مغربی مورخین کو دھوکا ہوا ہے، بلکہ غریبون کے ان حقوق کی حفاظت کے لئے اپنی آخری قوت تک مقابلہ کا چیلنج دینا کہ

لو منعونی عقالا مما اعطوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لجاھد تھم،

اگر الصدقات کے سلسلہ مین کسی ایسی ڈوری تک کے ادا کرنے سے انکار کرین گے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین ادا کرتے تھے، تو ان سے مین جہاد کرونگا،

جیسا کہ صحاح کی ہر کتاب مین مذکور ہے، حضرت عمرؓ کی مخالفت کے باوجود اس پر اصرار کرنا اس سے سمجھا جاسکتا ہی، کہ اسلام نے حکومت کے موازنہ مین جہان ان جدید مصارف کا اضافہ کیا ہی، وہین اسکی وصولی کی کتنی آسان اور کتنی قطعی ویقینی راہین اس نے اختیار کی تھین، خود الصدقات کا ایک مذہبی فریضہ ہونا اور کیسا مذہبی فریضہ کہ صحابہ مین بعضون کا خیال تھا،

ما مانع الزکوٰۃ بمسلم ومن لم یؤدھا فلا صلوٰۃ لہٗ (الخراج لابی یوسف ص ۴۵)

زکوٰۃ کا نہ ادا کرنے والا مسلمان ہی نہین ہے، اور جو زکوٰۃ ادا نہین کرتا اس کی نماز بھی نہین ہوتی،

قرآن اور صحیح حدیثون مین اس مطالبہ کے نہ ادا کرنے والون کے متعلق اتنی شدید تاکیدین مثلاً انکی پیشانی اس کے پہلو قیامت مین داغ دیئے جائین گے، (قرآن) قیامت کے دن اس کا مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوئی ہو، اس شخص کے سر پر بشکل اژدر یا چیختے ہوئے اونٹ اور بکریون کی شکل مین آنا، اوران سب پر مزید برآن حکومت کی تلوار کا اسکی وصولی کی ضمانت لینا کون کہہ سکتا ہی کہ دینے والے کے پاس اس مد کا ایک پیسہ بھی باقی رہ سکتا ہوگا، پھر سوچنا چاہئے کہ جس حکومت کے خزانہ مین ملک کے اون ناپرسان طبقات کے لئے ایسا انتظام کیا گیا ہو، اُس ملک کی امن وعافیت کا کیا حال ہوسکتا ہے، نہ کوئی باپ اپنے مرنے سے اس لئے خوف زدہ رہ سکتا ہی کہ اس کے بچے یتیم ہوجائین گے، بیوی بیوہ ہوکر لاوارث ہوجائیگی، نہ کسی کو اس کا خطرہ رہ سکتا ہے، کہ مین اگر اتفاقی طور پر کسی مصیبت یا مرض کا شکار ہوا اور میرا ہاتھ خالی ہوگیا، تو علاج کون کرائے گا، میرے بچے کیا کھائین گے، اگر کسی تاجر کو تجارت مین خسارہ آجائے، کسان کو زراعت مین نقصان پہونچے، کوئی لنگڑا ہوجائے، اندھا ہوجائے، بڈھا ہوجائے سب کو اطمینان ہے کہ میری امداد کیلئے سرکاری خزانہ مین مستقل کافی رقم موجود ہے، جس ملک کے مقروضون کو قرض توڑنے کے لئے نہ سودی قرض کی حاجت، نہ جائداد بیچنے کی ضرورت کہ ان کے قرض کی ادائی کا سامان حکومت کے خزانہ مین موجود ہے، بیوپار کاروبار کرنے والے مسافر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہین، نہ ان کو اسکی فکر کہ کس جگہ جاکر میرا ہاتھ خالی ہوجائے گا، کہ ہر ضلع ہر تعلقہ کے مقامی خزانہ مین اس کی امداد کا فنڈ موجود ہے، شاید صاحب حیثیت مسافرون کو شبہہ ہو کہ اس مد کا تعلق ہم سے نہین ہے، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر مطمئن کر دیا کہ

لا تحل صدقۃ الا فی سبیل اللہ	صدقہ کا مال جائز نہین (مستطیع لوگون
وابن السبیل (سنن بیہقی)	کے لئے) لیکن جہاد اور مسافر کے لئے،

بلکہ مسافرون کے لئے تو اسلام نے ایک جدید سہولت کا بھی اضافہ کر دیا ہو کہ یون تو ہر مسلمان پر واجب قرار دیا کہ

ان نزلتم بقوم فامروا لکم بما ینبغی	تم کسی کے یہان مہمان بن کر جب اترو، اور
للضیف فاقبلوا فان لم یفعلوا	میزبان اگر مہمان کے لئے مناسب انتظام کرے
فخذوا منہم حق الضیف الذی	تو اسکی مہمانی کو قبول کر لیا کرو، اور اگر میزبان
ینبغی لھم،	ایسا نہ کرے تو پھر ان سے مہمانی کا حق جو میزبان
(رواہ البخاری)	کی آمدنی کے مناسب حال ہو وصول کر لیا کرو،

اسی طرح غیر اقوام جب اسلامی حکومت کی رعایا بننے پر آمادہ ہوتی تھین، تو اس وقت اون سے جو معاہدہ لیا جاتا تھا، اس مین یہ بھی ہوتا تھا کہ

ضیافۃ من مر بھم من المسلمین	مسلمانون کا جو آدمی ان پر گذرے اسکی
(بیہقی)	مہمانی کرین گے،

اگرچہ فقہا نے اب "ضیافت" کے مسئلہ کو بجاے واجب کے مستحب قرار دیا ہے، لیکن جب بکثرت حدیثون مین:

من اصبح الضیف بفنائہ فھو	جس کے گھر کی انگنائی مین مہمان پہونچے
علیہ حق او قال دین ان شاء	تو مہمان کا اس پر حق قائم ہو جاتا ہے،
اقتضاہ ان شاء ترکہ (بیہقی)	(بعض روایتون مین ہے کہ انحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزبان پر
وہ دین ہے، چاہے اس دین کو مہمان
وصول کرے چاہے چھوڑ دے،

وغیرہ الفاظ آئے ہین تو مسافرون کے لئے اسلام کی مہیا کردہ سہولت کو آسان کیون نہ کیا جائے گھر مین رہنے والے کے لئے کسی باہر سے آنے والے مسافر کا کھانا غالباً باعثِ مشقت نہین ہوسکتا،

واقعہ یہ ہو کہ اسلام نے ابتدا مین جو نقشہ قائم کیا تھا، کاش کچھ دن بھی مسلمان اس نقشہ کو باقی رکھتے، تو آج گھبرا گھبرا کر نہ دنیا بیمۂ انشورنس کے دامن مین پناہ ڈھونڈتی، نہ غریب مخلوق اور کاشتکارون کے مشکلات کا حل باہمی اتحاد والی سود خوار انجمنون مین سوچا جاتا، گویا "پنجۂ گرگ" (ساہوکار) سے نکال کر اس کے حلق پر ان انجمنون کی چھری چلائی جاتی ہے، مسلمان علماء کو مجبور کیا جاتا ہے، کہ سود اور بیمہ وغیرہ کی شکلون کے جواز کی صورت پیدا کرین، سمجھا جاتا ہے، کہ اسلام کے نظام مین ان مشکلات کے حل کی کوئی تدبیر نہ تھی، اور گویا اب یورپ کا ذہن پہلی دفعہ ان مسائل کی طرف منتقل ہوا، لیکن کیا کیجئے کہ کسی تصویر کو کسی ایک حصہ کے دیکھنے سے پوری تصویر کا حال معلوم نہین ہوسکتا، صرف زندگی کا یہ ایک شعبہ ہو جس مین اسلام کی ان نکتہ نوازیون کا کوئی ٹھکانا ہے، ابھی یورپ اور اس قسم کے دوسرے مفکرون کو مدت چاہئے جو اللہ کے بنائے ہوئے نظام نامۂ حیات کو خود تو کیا بنا سکین گے، سمجھ لین تو غنیمت ہو،

الصدقات کے متعلق ایک تاریخی تغیر

اس مین کوئی شبہہ نہین کہ اس جدید اسلامی نظامِ زندگی کی جو شادابی و تر و تازگی عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ مین تھی، وہ بعد کو باقی نہ رہی، لیکن اس معاشی نظام کی پہلی اینٹ خدا جانے کن اسباب کے تحت کہتے ہین، کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانہ مین اپنی جگہ سے سرک گئی، آپ نے "الصدقات" کی اور تمام مدون (یعنی مویشی کاشت کرور گیری) کی شکل مین جو وصول ہوتی تھی

تھی ان کو تو باقی رکھا، لیکن روپیہ اور اشرفی سونا چاندی کی شکل مین جو اندوختہ مسلمانون کے پاس تھا، اوسکی زکوٰۃ کو بجائے حکومت کے پھر انفرادی طور پر دینے کی اجازت دیدی، امام ابوبکر جصاص رازی اپنی تفسیر مین ناقل ہین،

اما زکوٰۃ الاموال فقد کانت	الاموال (سونا چاندی) کی زکوٰۃ رسول اللہ
تحمل الی رسول اللہ صلی اللہ	صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر و عثمان
علیہ وسلم وابی بکر وعمر و	رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد تک انہی بزرگون
عثمان ثم خطب عثمان فقال ھذا	تک پہنچائی جاتی تھی، یعنی (حکومت مین
شھر زکوتکم فمن کان علیہ	یہ آمدنی داخل ہوتی تھی) پھر حضرت عثمان
دین فلیؤدہ ثم لیترک بقیۃ	رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن خطبہ دیا
مالہ،	اور فرمایا کہ (رمضان) یہ مہینہ تمھاری
(احکام القرآن جصاص ۱۵۵ جلد ۲)	زکوٰۃ ادا کرنے کا مہینہ ہے، پھر جس پر
	کچھ دین (باقی ہو) وہ ادا کر دے اور
	اپنے باقی مال کو چھوڑ دے،

جصاص لکھتے ہین کہ اس دن کے بعد سے

فجعل لھم اداءھا الی المساکین	حضرت عثمانؓ نے زکوٰۃ دینے والون کو
وسقط من اجل ذلک حق الامام	اختیار دے دیا کہ خود براہ راست مسکینون
فی اخذھا،	کو دیدیا کرین، اس وجہ سے امام (حکومت)
	کا جو حق اس مد کی وصولی کا تھا، وہ ساقط
	ہوگیا،

حالانکہ چند سطر پہلے جصاص ہی نے آیت قرآنی

خذ من اموالھم صدقۃ	ان کے مال سے اے پیغمبر صدقہ لیا کرو،

کے تحت یہ لکھا تھا کہ

یدل علی ان اخذ الصدقات الی	یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ "الصدقات" کی وصولی
الامام وانہ متی اداھا من وجبت	امام (حکومت) کے سپرد ہے، اور وہ شخص جس
علیہ المساکین لم یجزہ لان حق	پر زکوٰۃ واجب ہے، اگر خود مسکین کو (براہ
الامام قائم فی اخذھا فلا سبیل	راست) ادا کر دے گا، تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی
الی اسقاطہ	کیونکہ زکوٰۃ کی وصولی کا جو حق امام (حکومت)
	کو حاصل تھا، وہ اب تک باقی ہے، اور اس
	کے ساقط ہونے کی کوئی وجہ نہین ہے،

جب یہ قرآنی قانون ہے اور تنظیم جس کا قرآن نے ارادہ کیا تھا، اس کا اقتضا بھی یہی ہے، سمجھ مین نہین آتا، کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے یہ کیسے اخذ کر لیا گیا کہ آیندہ ہمیشہ کے لئے مالی زکوٰۃ کی حد تک یہ قانون منسوخ ہوگیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قول سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خصوصیت کیساتھ اس سال حضرت نے کسی خاص وجہ سے اموال کی زکوٰۃ کا اختیار خود مالکون کو عطا کر دیا تھا، اور یہ ہو سکتا ہے کہ امام کسی سال اپنی مرضی سے اپنے کسی اختیار کو دوسرے کے سپرد کر دے، لیکن اس کو دوامی قانون بنا دینا، اور حضرت عثمانؓ کے بعد ہر امام سے اس حق کو چھین لینا جو قرآن کا عطا کیا ہوا حق بلکہ سپرد کی ہوئی خدمت ہے، آخر کس بنا پر جائز ہو سکتا ہے، مگر باوجود اس ایک مد کے انفرادی ہونے کے "الصدقات" کی اور دوسری مدین جو کم نہ تھین، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، کہ خلافت عباسیہ تک ان مدون کی آمدنی کروڑون سے متجاوز ہوگی، جرجی زیدان نے موجودہ مورخین

کی تحقیقات کی بنا پر لکھا ہی کہ

انّ متوسط جبایة الدولة فی العصر	عباسی عہد کی ابتدا مین حکومت کی آمدنی
العباسی الاولی بلغ ۳۶۰ ملیون درہم	تین سو ساٹھ ملین درہم سالانہ آمدنی
فی العام (صفحہ ۷۰ جلد ۳)	تھی،

جرجی زیدان ہی کا بیان ہے کہ خراجی آمدنی جو حکومت کے مصارف پر خرچ ہوتی تھی،

لم ینفق منہا علیٰ مصالح الدولة اکثر	حکومتی کاروبار مین گذشتہ بالا آمدنی مین
من ۵۰ ملیون والباقی نحو ۳۰	سے صرف پچاس ملین خرچ ہوتا تھا، اور
درھم تبقی فی بیت المال،	تیس کروڑ درہم بیت المال مین باقی رہجاتا
(صفحہ ۷۰ جلد ۳)	تھا،

بظاہر یہ تیس کروڑ درہم والی آمدنی یہی "الصدقات" کی آمدنی تھی، جن کے مصارف "مصالح الدولہ" کے سوا وہی تھے جن کی فہرست حق تعالیٰ نے قرآن مین نازل کی تھی، اور جہان تک میرا خیال ہی اکثر و بیشتر ان مین بے ضابطگی کم برتی جاتی تھی، آخر کتاب الخراج امام ابو یوسف ہارون الرشید کے زمانے کی کتاب ہی، اس کو ہارون نے فرمایش کر کے لکھوایا ہے، کہ حکومت کے دستور العمل کی حیثیت سے وہ کام آئے، اس کتاب مین "الصدقات" کے متعلق جو قوانین درج ہین، اُن کے بعض اجزا گذر چکے، اسی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے، کہ گو مسلمان عباسیون کے عہد تک پہونچتے ہوئے، بہت کچھ اصل راہ سے ہٹ گئے تھے، لیکن پھر بھی عام مسلمانون کی فراغبالیان ایسی تھین، جنھین تاریخ کی زبان باوجود چھپانے کی انتہائی کوششون کے اب بھی چھپا نہ سکی، جرجی زیدان جیسے آدمی کے قلم سے بھی یہی الفاظ نکل پڑے، کہ حکومت کے خزانہ مین ملک کا جو کچھ روپیہ جاتا تھا،

نیعود الی العامة کانّہ لم یؤخذ	وہ بالآخر عامہ (ملک کے عام باشندون)

منھم وھی سنة الارتزاق تظھر	کی طرف واپس آجاتا تھا، ایسا معلوم
للدول وھلة انّھا من خصائص	ہوتا تھا کہ گویا لوگون سے کچھ لیا ہی نہین
التمدن الاسلامی،	گیا، اور یہ نتیجہ اس خاص رواج کا تھا،
	جسے الارتزاق (وظائف حکومت) کہتے
	ہین، پہلی نظر مین معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی
	حکومتون کی یہ خاص خصوصیت تھی،

جرجی زیدان اگرچہ اس "ہنر" پر عیب کی چادر اڑھانے کے لئے اس پر اضافہ بھی کرتا ہی یعنی شاید یہ کوئی نئی بات نہ تھی، قدیم زمانہ مین :

فاھل اثینیا وھم خاصة الیونانین	ایتھنز کے باشندون کا بھی یہی حال تھا، او
کانوا لا یعملون عملاً ولا یحترفون	یہ یونانیون مین خواص کا طبقہ تھا جو نہ کوئی
حرفة فی سبیل الرزق وانما کانت	کاروبار کرتے تھے، اور نہ کوئی دستکاری
ارزاقھم من خزینة الدولة	کا پیشہ روزی حاصل کرنے کی راہ مین اختیار
یتناولونھا رواتب فی اوقات	کرتے تھے، ان کے وظائف حکومت کے خزانہ
معینة او ھبات فی اوقات غیر معینة	سے جاری تھے، جسے وہ ماہ بماہ مقررہ اوقات

ے الارتزاق دراصل ہمارے یہان کے "وظائف" کے لفظ کا ترجمہ ہی، اسلامی حکومتون کے بیت المال اور خزانہ کی یہ ایسی خصوصیت ہی جس کی یادگار بحمد اللہ کسی نہ کسی شکل مین اب تک ان ممالک مین پائی جاتی ہی، جہان اسلامی حکومت قائم ہے، خصوصاً سلطنت آصفیہ کا خزانہ عامرہ اس زمانہ مین نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب و عجم مین بھی اس خاص معاملہ مین کافی شہرت رکھتا ہی، خدا کا فضل ہے، کہ اب تک وظائف کے نام سے ہر سال بیش قرار رقوم ماہوار یا یکمشت ارباب استحقاق مین تقسیم ہوتے رہتے ہین، جن لوگون کو اسلامی بیت المال کی اس خصوصیت اور نقطہ نظر

عربی	اردو
...... ولم یکن	مین وصول کرتے تھے یا غیر معین طور پر بطور
ہمہم شغل غیر سماع الخطب السیاسیۃ	ہبہ اور بخشش کے ان کو ملا کرتا تھا، اسی کا
او العلمیۃ او التمشی فی حدائق	نیتجہ تھا، کہ ایتھنز والون کا کام اس کے سوا
المدینۃ وحضور الاحتفالات	کچھ نہ تھا، کہ سیاسی یا علمی لکچرون کو گھوم
الرسمیۃ ونحوھا،	گھوم کر سنا کرین، یا باغون اور پارکون
	مین گھوما کرین، یا ملک کی سرکاری مجلسون

(صفحہ ۶۶)

مگر اس بندۂ خدا کو پھر خیال آیا کہ آخر پھر وہ کیا چیز ہے جو اسلامی تمدن دنیا کے سارے تمدنون سے ہر مورخ کو جدا نظر آتا ہی، پھر خود جواب دیتا ہی کہ یونانیون کی یہ خصوصیت

عربی	اردو
کانت محصورۃ فی اثینا او غیرھا من	یونانیون کی یہ خصوصیت صرف ایتھنز شہر
العواصم الکبری اما المسلمون	یا چند دوسرے مرکزی شہرون تک محدود
فتوسعوا فیہ حتی شمل کل مدینۃ	تھی، لیکن مسلمانون نے اس مین وسعت
وکل طبقۃ،	پیدا کی حتی کہ ہر شہر اور ہر طبقہ تک اس کو
(صفحہ ۶۷)	عام کر دیا،

پھر اس کی توجیہ و تاویل مین حسب عادت آسمان و زمین کے قلابے ملانے کی بیکار کوشش

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۳) کا علم نہین ہے، وہ حیدرآباد پہونچ کر وظائف کے رواج پر حیرت کا اظہار کرتے ہین، مین نے بعضون سے تو یہان تک سنا ہے کہ اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر صرف سلطنت آصفیہ کا ہی ایک خزانہ ہی جہان سے بغیر کسی معاوضہ کے لوگون کو امدادین ملتی ہین، شاید جنگ عظیم کے بعد یورپ کے بعض ممالک نے بھی بے روزگارون کے لئے کچھ وظائف منظور کئے ہین، لیکن جو باتین آج دوسری قومون کے لئے نئی ہین مسلمانون کے لئے اس مین کوئی اجنبیت نہین ہی،

کی ہی، یہ مذبوحی کوشش یہانتک پہونچتی ہے، زیدان نے دعوی کیا ہی کہ اسلام سے پہلے سلاطین عرب کا بھی یہی دستور تھا، غریب عرب بھلا سلاطین سے اتنا آشنا ہی کب تھا، اور کچھ تھا بھی تو عرب کو اس سرسبزی و شادابی اس امن وعافیت سے قبل الاسلام کیا تعلق تھا جس کا نظارہ عرب اور عجم کی آنکھون نے اسلامی دور مین دیکھا کہ ہر یتیم، ہر بیوہ، ہر معذور، ہر مقروض، ہر تاوان رسیدہ تاجر مصیبت زدہ کسان سب اپنی جگہ مطمئن ہین کہ ان کی انجمن اتحاد باہمی اور بیمہ کمپنی مین ان کا کثیر سرمایہ جمع شدہ ہے، خصوصاً کاشتکارون کے ساتھ حکومت کی دلچسپیان اس حدتک بڑھی ہوئی تھین، کہ زمین اور آبپاشی کے انتظامات کے ساتھ ساتھ مسلم ہی نہین بلکہ غیر مسلم کاشتکارون تک کے لئے یہ حکم تھا کہ اگر تخم اور ہل بیل وغیرہ کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہ ہو تو

عربی	اردو
ان یدفع للعاجز کفائتہ من بیت	جو کسان تخم وغیرہ کے مہیا کرنے سے معذور
المال قرضاً لیعمل فیھا،	ہو اُسے سرکاری خزانہ سے بطور قرض کے
	اتنا سرمایہ دیا جائے جس سے اپنے کاروبار
(فتح القدیر صفحہ ۳۶۷ جلد ۳)	کو جاری کر سکے،

کون کہہ سکتا ہی کہ تقاوی کی رقم مسلمانون ہی کی نکالی ہوئی ہے، یا ہندوستان مین ابتک اس کا رواج ان ہی کی بدولت باقی ہی،

بہرحال اسلامی حکومت کے خزانہ مین جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے، اوس کے جو اغراض تھے یا اون کو ہونا چاہئے غالباً اس کے متعلق کافی بحث ہو چکی جن لوگون کے سامنے معاش کا یہ نظام پیش کیا گیا ہی وہ اب فیصلہ کر سکتے ہین کہ بیت المال کے اس عجیب وغریب نظام کے بعد پھر کیا دنیا کو بیمۂ انشورنس، انجمہائے اتحاد باہمی جیسی سطحی اور وقتی معالجون کی ضرورت باقی رہتی ہے، بیروزگاری کی جو عام شکایت پھیل گئی ہے، کیا اس کا احتمال اس وقت بھی باقی رہ سکتا ہی جب حکومت اپنی رعایا

کے بے سرمایون کو سرمایہ دینے کے لئے اپنے پاس مستقل بیش قرار رقم رکھتی ہو، ہبہ بھی دینے کے لئے تیار ہو اور قرض بھی،

"الصدقات" کی "وصولی" اور "صرف" کے متعلق اسلام نے جن نکات کو اپنے پیش نظر رکھا ہی، اگرچہ موٹی موٹی باتین اس سلسلہ مین جو یہان قابلِ اندراج ہو سکتی تھین، ان کا بیان گذر چکا لیکن اسی ذیل کی دو چیزین یہ چھوٹ گئی تھین، مناسب ہے کہ آخر مین ان کا بھی اضافہ کر دیا جائے،

میرا مطلب یہ ہو کہ منجملہ گذشتہ بالا امور کے "الصدقات" کے متعلق اسلام نے ان دو شرطون کا بھی اضافہ کیا ہی،

(۱) ایک تو یہ ہو کہ جس طرح الصدقات کی مد کی آمدنی کو الخراج والجزیہ وغیرہ کی آمدنیون سے بالکلیہ جدا رکھنے کا حکم ہی، اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہی، کہ اس مد کی آمدنی کا ایک حبہ کسی ایسے آدمی کو نہین مل سکتا، جو اسلامی نقطۂ نظر سے غنی اور صاحبِ حیثیت ہو، اس غنی سے مراد یہ نہین ہی کہ وہ ہزارون اور لاکھون کا مالک ہو، بلکہ ملک کا ہر ایسا باشندہ جو اپنی اور اپنے اہل وعیال کے روزمرہ مصارف کے سوا دوسو درہم یا ساڑھے باون تولہ چاندی[1] یا اوس کے مساوی کسی سرمایہ کا مالک ہو، اس کے لئے اس آمدنی کا ایک حبہ تک حرام ہے، اس معاملہ مین کتنی شدید احتیاط کی ضرورت ہی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہی، کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک آدمی آیا، جس کے مشکیزے مین دودھ تھا، حضرت عمرؓ کو بھی ایک پیالہ اس دودھ کا ملا، دودھ کچھ مزیدار تھا، آپنے دریافت فرمایا کہ کہان سے لائے ہو، بولا کہ فلان گاؤن کی چراگاہ پر میرا گذر ہوا، وہان "الصدقات" کے اونٹ چر رہے تھے، ایک اونٹنی کا لوگ دودھ دوہ رہے تھے، مین نے بھی تھوڑا سا مانگ کر اپنے چھاگل مین رکھ لیا، یہ سننا تھا، کہ حضرت عمرؓ پر عجب حالت طاری ہو گئی، راوی کا بیان ہی:-

---

[1] یہ ہندوستان کے قدیم فقہا کے حساب کا نتیجہ ہی، اس زمانہ مین ساڑھے چھتیس تولہ ہی کو غنی کا نصاب قرار دیا جا رہا ہی، میرے نزدیک پہلی صورت زیادہ درست ہی،

فادخل اصبعہ فی فیہ واستقاءہ (بیہقی) — اپنی انگلی منہ مین ڈالی اور قے کرتے جاتے تھے،

بہرحال قانونی "الغنی" کے لئے تو قطعاً اس مال کا ایک ایک پیسہ حرام ہے، لیکن جو قانونی غنی نہ رکھتا ہو بلکہ شب و روز کی خوراک سے زیادہ اوس کے پاس سامان ہو ایسے آدمیون کے لئے یہ حرام نہین ہی، لیکن "الصدقات" کے شعبہ سے مانگنا اوس کے لئے بھی ناجائز ہے، اس سے سمجھا جا سکتا ہی، کہ ایک طرف ملک کے ان مصیبت زدہ طبقات کے لیئے اسلامی حکومت نے اپنے خزانہ مین اگرچہ یہ سارا انتظام بڑی طاقت سے کر رکھا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اُسکی نظر اس پر بھی تھی، کہ کہین خزانہ کی اس مد پر بھروسہ کر کے انگلستان کے خوش باشون کی طرح بیکاری اور بیکار وقت گذاری کے لوگ عادی نہ ہو جائین، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس پر خاص نظر تھی، جب کوئی اس مد سے مانگنے والا آتا، تو آپ ایک خاص نظر سے اس کو دیکھتے، اور نرمی سے مختلف الفاظ مین اُن کو سمجھاتے، جس کا مطلب یہی ہوتا تھا، کہ حتی الوسع "الصدقات" کے مال سے صاحبِ استطاعت لوگون کو پرہیز ہی کرنا چاہیئے، حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہین، کہ مجھ پر اور میرے اہل وعیال پر ایک وقت مین بڑی تنگی پیدا ہو گئی، گھبرا کر مین حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت مین اسلئے حاضر ہوا کہ الصدقات کی رقم سے کچھ میری مدد فرمائی جائے، کہتے ہین کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے میرے عرض کرنے پر ارشاد فرمایا:-

من استغنی اغناہ اللہ من استعف اعفہ اللہ، — جو بے نیازی کا رویہ اختیار کرے گا خدا اسے بے نیاز رکھے گا، اور جو دوسرون سے لینے مین احتیاط برتے گا، خدا بھی اس کی آبرو کی حفاظت کرے گا،

حضرت ابوسعیدؓ پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ

فلاستعف فیغننی اللہ ولاستغننی — مین دوسرون سے مانگنے مین احتیاط کرونگا،

فیغنی اللہ، — خدا میری آبرو بچائے گا، اور مین اپنے کو مخلوقون سے بے نیاز رکھون گا، خدا مجھے بے نیاز رکھے گا،

کہتے ہوئے واپس ہوئے، ان کا بیان ہے کہ اپنے اس استعفاف واستغنار کے نتائج کو بالآخر مین نے اپنی آنکھون سے اس شکل مین دیکھا کہ

سالت علینا الدنیا فغرقتنا الّا من عصمہ اللہ (الطحاوی) — ہم پر دنیا کا سیلاب چھا گیا، اور ہمین اوس نے ڈبو دیا، لیکن وہی جنھین اللہ نے محفوظ رکھا ہو،

اس کاہلی اور بے عملی کے خطرہ کے انسداد کے لئے تقریبًا عام مجلسون مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہان چند اور باتین فرماتے، ان مین ایک فقرہ عمومًا یہ بھی ہوتا تھا،

الید العلیا خیر من الید السفلی، (صحاح) — اوپر والا ہاتھ (دینے والا ہاتھ) نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے،

یہ بھی ارشاد ہوتا

الایدی ثلث فید اللہ العلیاء و ید المعطی التی تلیھا وید السائل السفلی الی یوم القیامۃ فاستعفف ما استطعت ولا تعجز عن نفسک ولا تلام علی کفاف واذا آتاک اللہ خیرًا فلیر علیک (الطحاوی) — ہاتھ تین ہین، تو سب سے اونچا ہاتھ خدا کا ہے اور دینے والے کا ہاتھ (خدا کے ہاتھ کے بعد ہے) اور مانگنے والے کا ہاتھ سب سے نچلا ہاتھ ہے، (اور یہ نسبت قیامت تک قائم رہیگی) پس جہانتک مانگنے سے بچ سکتے ہو، بچو، اور خود کمانے سے نہ تھکو، اور بقدر کفایت اگر تمھارے پاس ہو تو پھر قابلِ ملامت نہ ہوا، اور خدا تمھین جب کچھ خیر (مال) دے تو چاہئیے کہ اسکو اپنے اوپر نمایان کرو،

یعنی حتی الوسع لوگون کو واقعی مستحقین کے اس حق سے بچنے اور کنارہ کش رہنے کا حکم دیا جاتا تھا، اصرار اس پر کیا جاتا تھا، کہ جہان تک ممکن ہو اپنی خداداد قوتون سے روزی حاصل کرنے مین کوشش کیجائے (لا تعجز عن نفسک کا یہی مطلب ہے) اور زیادہ امیر نہ ہونے کو کوئی جرم نہ خیال کرے، اور اس جرم سے بریّ ہونے کے لئے "الصدقات" کی رقم سے امیری نہ پیدا کی جائے، (مثلاً عمومًا اپنی لڑکیون کی شادی مین نمایشی مصارف کے لئے لوگ کنیادانی مانگا کرتے ہین کہ سوسائٹی مین ورنہ بے عزتی ہوگی)

(۲) دوسری بات اس سلسلہ مین جو یہان قابلِ ذکر ہے وہ الصدقات کی ایک اور خصوصیت بھی ہے،

مقصد یہ ہے کہ جس وقت مسلمانون سے "الصدقات" کا مطالبہ کیا گیا، بدگمانون کو شاید یہ اندیشہ ہو سکتا تھا، کہ کہین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (العیاذ باللہ) خود اپنی اور اپنے اہلِ خاندان کی معاشی مشکلات کے حل کی یہ راہ تو نہین بنائی ہے، خصوصًا جب اس زمانہ مین بھی اور اکثر ممالک مین اس وقت تک خیر و خیرات کی رقوم یا مصارفِ دعوت وغیرہ کا استحقاق انہی لوگون کے ساتھ زیادہ مخصوص سمجھا جاتا ہے، جن کی زندگی مذہبی ہو اور جو مذہب کی نمایندگی کرتے ہون،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبی نمایندہ ہونا اس بنا پر آپ کے بعد مسلمانون مین مذہبی نمایندگی کا قدرۃً زیادہ استحقاق آپ کی آل اولاد اور آپکے خاندان والون ہی کو ہو سکتا تھا، خصوصًا اس لئے بھی کہ عمومًا اسلام سے پہلے مذہبی نمایندگی کے لئے صفات سے زیادہ ذاتی اور نسبی خصوصیات کو عمومًا دخیل سمجھا جاتا تھا، ہندوستان ہی مین یہ عہدہ صرف اون لوگون کے لئے مخصوص ہے، جو برہمنون کی نسل سے ہون، اور یہی حال تقریبًا اکثر غیر اسلامی سوسائٹیون کا ہے، میرا خیال ہے کہ غالبًا یہ بھی ایک مصلحت تھی، جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اوپر اور اپنے خاندان والون پر خواہ وہ

غربت و فقر کے کسی حال مین ہون، "الصدقات" کی آمدنی کو قطعی طور پر حرام فرما دیا، اس سلسلہ مین حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اتنا نازک احساس رکھتے تھے، کہ حضرت امام حسن علیہ السلام بچے تھے سامنے "الصدقات" کی مد کی کھجورون کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا، سرکتے ہوئے ڈھیر کے پاس پہونچ گئے اور صرف ایک کھجور منہ مین اٹھا کر ڈالدی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ پڑگئی، جھپٹ کر دوڑے اور بے قرار ہو کر فرمانے لگے،

کخ کخ ارم بها، تھو تھو اسے پھینک دو،

اور فرمانے لگے،

اما شعرت انا لا ناکل الصدقة تم نہین سمجھتے کہ ہم لوگ صدقہ نہین کھاتے،

(رواہ البخاری)

بعض روایتون کے الفاظ ہین،

انا لا تحل لنا الصدقة ہم لوگون کے لئے صدقہ کا مال جائز نہین ہی،

اسی بنا پر فقہائے اسلام نے بھی بالاتفاق اپنی قانونی کتابون مین اس دفعہ کو قانون کی شکل مین داخل فرمایا اور اب تک اس پر مسلمانون کا اتفاق ہے، کہ سادات وآلِ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رشتہ دارون پر الصدقات کی آمدنی حرام ہی،

آخر مین ایک شبہہ کا ازالہ باقی رہجاتا ہی، مین نے کہا تھا کہ "الصدقات" کے مطالبون کو ادا کرنے والون کو اسلام ہر قسم کے حکومتی مطالبات سے مستغنی کر دیتا ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کی رعایا مسلمان ہو کر اس طرح اپنے آپ کو حکومتی مطالبات سے مستغنی کراتی رہے تو پھر حکومت کی کشوری و ملٹری و رفاہیات عامّہ کے مصارف کے لئے کہان سے رقم آئیگی،

لیکن اس کا پہلا جواب تو یہی ہے، جو گذر چکا کہ اسلامی حکومت کی ہر وہ اراضی جو غیر مسلم

رعایا کے قبضہ مین ہو خراجی ہوتی ہی، اگر کوئی مسلمان اس کو خرید بھی لے گا، اور اس کے سوا اس زمین پر قبضہ کرنیکی کوئی دوسری قانونی شکل نہین، جب بھی وہ خراجی ہی باقی رہتی ہے، البتہ جزیہ کی آمدنی مسلمان ہونے سے ساقط ہو جاتی ہے، اگرچہ بنی امیّہ کے حریص امراء نے مسلمون پر جزیہ باقی رکھا تھا، لیکن بہت جلد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ مین اس غلط قانون کی اصلاح ہو گئی،

بہرحال خراج کی وصولی کے لئے خراجی زمینین پہلے تو کافی ہین، نیز "الصدقات" کے مصارف جہان مذکورۂ بالا طبقات کے لوگ قرآن نے بتائے ہین، انہی کے ساتھ اس آمدنی کو خود مکتفی بنانے کے لئے تخرج سے ایک اور مد کا الصدقات کے مصارف مین قرآن ہی نے اضافہ بھی کر دیا ہے، یعنی العاملین علیہا، یعنی جو لوگ صدقات کے تحصیل وصول کا کام کرتے ہین، وہ بھی خواہ امیر ہون یا غریب اپنی تنخواہ "الصدقات" کی مد سے بخوشی لے سکتے ہین، پس محکمۂ مال کے مصارف کی ادائگی کی گنجایش تو خود "الصدقات" مین ہی، نیز ایک مد اس مین "فی سبیل اللہ" کی بھی ہی، یعنی تبلیغی و دفاعی قوتون پر بھی یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے، رہ گیا محکمۂ عدلیہ سو اسلام مین قضا کا کام دراصل ایک قسم کی عبادت ہے، اگر قاضی غیر مستطیع ہے، تو اس کو بھی تنخواہ اس مد سے دلائی جا سکتی ہی، اور محکمۂ تعلیمات کے لوگون کو بھی فقہاء نے بصورتِ احتیاج اس آمدنی کے مصارف مین شریک کیا ہی، بیضاوی نے سبیل اللہ کے ذیل مین القناطر والمصانع بھی لکھا ہے، گویا اس بنا پر مواصلات پر جو مصالحِ مسلمین ہی کی ایک چیز ہے، یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے، خلاصہ یہ ہی کہ قرآن مجید نے "الصدقات" کے مصارف ایک تو وہ رکھے ہین، جن کا تعلق مصیبت زدہ طبقات سے ہے، لیکن اس لئے کہ اگر کسی وقت اسلامی حکومت کے پاس بجز "الصدقات" کی مد کے اور کوئی آمدنی نہ رہ جائے، تو چند ایسے مصارف کا اسکی ذیل مین اضافہ کیا ہے، جن کے بعد ایک حکومت کے قیام کے لئے جن امور کی ضرورت ہی، سب کی تکمیل ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ ان ہی مصارف مین ایک مد ان لوگون کی بھی ہے جو محض مالی کمزوریون کی وجہ سے اسلامی حکومت اور اسلام کی مخالفت کرتے ہین، جیسا کہ اس زمانہ مین سیاسی شورش پسندون کے

ایک گروہ کی یہی حالت ہے، ان لوگوں کو چپ کرنے کے لئے بھی "الصدقات" کے مصارف میں قرآن نے مولفۃ القلوب کی ایک مد رکھی ہے، اگرچہ عام طور پر فقہاء کہتے ہیں کہ یہ مصرف صرف ابتدائے اسلام کی حد تک محدود تھا، اور اب ساقط ہو گیا، دلیل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اثر پیش کیا جاتا ہے کہ آپ نے مولفۃ القلوب کے بعض افراد کو دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا، کہ اب اسلام اتنا قوی ہو چکا ہے، کہ ان لوگوں کی تالیف قلب کی ضرورت نہ رہی، حالانکہ قصہ صرف اس قدر ہے، کہ چند خاص لوگوں کو حضرت عمرؓ نے دینے سے یہ فرماتے ہوئے انکار کر دیا تھا کہ

ان اللہ اعز الاسلام فاذھبوا — اب خدا اسلام کو عزت و شوکت عطا کر چکا

پس تم دونوں جاؤ (کچھ نہ ملے گا)

لیکن اس کا یہ مطلب قرار دینا کہ ہر شخص کے لئے حضرت عمرؓ نے اس مد کو ساقط کر دیا، میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا، قرآن نے جس مصرف کو منصوص کیا ہو، اس کو اولاً حضرت عمرؓ منسوخ ہی کیسے کر سکتے ہیں، نیز ایک ایسی واحد خبر سے قرآن کے ایک قانون پر خط نسخ نہیں پھیرا جا سکتا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہو کہ یہ امام اور حکومتِ وقت کے صوابدید پر ہے، جس وقت جن لوگوں کے لئے اسکی ضرورت سمجھے دے، جن کے لئے ضرورت نہ سمجھے نہ دے، آخر میں اس سلسلہ میں فقہاء کے اس مذکورہ بالا مسئلہ کو بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ واقعی ضرورتوں کے لئے اسلامی حکومت رعایا پر بقدر ضرورت جدید محصول عائد کرنے کا بھی اختیار رکھتی ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، میں نہیں خیال کرتا کہ ان امور کے عائد ہوتے ہوئے اسلامی حکومت کو کبھی دشواری کا سامنا ہو گا،

نوٹ: یہ مضمون پریس میں چھپ رہا تھا، کہ ۲؍ دسمبر ۱۹۴۲ء کا چلا ہوا ایک تلغرافی پیام لندن سے ہندوستان میں وصول ہوا، میں چاہتا ہوں کہ قارئین کرام کے لئے اس کو یہاں نقل کر دوں، اخبار رہبر دکن مورخہ ۴؍ دسمبر میں اس تار کا ترجمہ ان الفاظ میں درج کیا گیا ہے:

لندن ۳؍ دسمبر، سر ولیم بیورج (مشہور محقق معاشیات) نے "برطانیہ میں غربت کا خاتمہ" کرنے کے لئے جو لائحہ عمل پیش کیا ہے، اس کو انگلستان اور امریکہ دونوں جگہ اخبارات میں صفحہ اول پر نمایاں کیا گیا ہے، "ڈیلی ٹیلی گراف" کہتا ہے، کہ لائحہ عمل کا اساسی نقطہ یہ ہے، کہ اس میں معیشت کی ایک قومی اقل سطح مقرر کی گئی ہے جس سے نیچے گرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، اس اخبار کے پیش نظر وظائف (جو شوہر اور بیوی کے لئے دو دو پونڈ تک ہوں گے) ہر شخص کے لئے طبی معالجہ بچوں کے لئے فی ہفتہ آٹھ شلنگ کا الاؤنس، بیواؤں کے لئے فی ہفتہ دو پونڈ اور ازدواج، مادری کے فیاضانہ عطیے ہیں،

جب کہ سر ولیم نے بتایا، یہ لائحہ عمل ایک ہمہ گیر بیمہ ہے جس سے آجروں اور مزدوروں کی یکساں بہبودی کی گہوارہ سے گور تک نگہداشت ہو گی، تدفین کے مصارف تک کی گنجائش رکھی گئی ہے، اور بیماری، صحت، برسر روزگار ہو یا بے روزگار جوانی ہو یا بڑھاپا، کسی کو اس معینہ سطح سے پست تر ہونے نہیں دیا جائے گا، عرب میں جو لائحہ عمل صدیوں پہلے خدا کی طرف سے بنی آدم کو سپرد کیا گیا، ۱۹۴۲ء کی تیسری دسمبر کے قارئین دیکھئے کہ اسی ضرورت کو عقل بھی پانے لگی، فصل من مدد کر،

اسلامی قانون فوجداری

مولانا سلامت خان المعروف بہ خداقت خان کی کتاب الاختیار کا ترجمہ جس میں تمام تعزیرات و جرائم کے متعلق پندرہ ابواب میں اسلامی قانون فوجداری کی تمام دفعات فقہ کی مستند کتابوں کے حوالہ سے جمع کی گئی ہیں، قانون پیشہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید اور ضروری ہے،

ضخامت ۴۵۳ صفحے، قیمت :- ہے

"منیجر"

میر کا فارسی کلام

از

جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم اے (علیگ) لکچرار شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میر تقی میر جن کا کلام اردو مین ناقدین کے نزدیک وہی درجہ رکھتا ہے جو فارسی مین سعدی یا حافظ کا ہے، عام طور پر صرف اردو غزل گو کی حیثیت سے ہی متعارف ہین، عرصہ ہوا ان کے فارسی کلام کے متعلق کسی صاحب کا مضمون کسی رسالہ مین نظر سے گذرا تھا، لیکن خود کلام نظر سے نہین گذرا تھا، ابھی کچھ دنون سے مولانا کیفی صاحب چریاکوٹی مسلم یونیورسٹی مین قلمی کتابون کی ایک توضیحی فہرست تیار کرنے پر مقرر ہوئے ہین، مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم کے عطا کردہ کتب خانہ مین کیفی صاحب کو ایک قلمی بیاض ملی، جس کے متعلق پرانی فہرست مین صرف بیاض اشعار قلمی تحریر تھا، غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ میر تقی میر کا فارسی کلام ہے، چنانچہ پہلے ورق پر جس کی نصف سطر جلد بندی مین کٹ گئی ہے، یہ عبارت صاف پڑھنے مین آتی ہے،

"دیوان نظم فارسی کہ میر تقی میر گفتہ اند"

ہر غزل مین مقطع مین میر بطور تخلص استعمال ہوا ہے، اور رباعیات سے بھی جن کی ایک کثیر تعداد دیوان غزلیات کے آخر مین شامل ہو اسی خیال کی تصدیق ہوتی ہے، بیاض پر تاریخ کتابت یا کاتب کا نام درج نہین ہو، لیکن کاغذ نہایت پرانا اور بوسیدہ ہے، خط اگرچہ شکستہ ہے، لیکن نہایت پختہ اور پاکیزہ ہو، اور سوائے دو چار مقامات کے اشعار ہر جگہ بخوبی سمجھ مین آجاتے ہین،

علاوہ تخلص کے جس کا ذکر اوپر ہوا داخلی شہادت یعنی کلام کے مطالعہ سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کہ یہ کلام میر ہی کا ہے، اس سلسلہ میں سب سے نمایان بات یہ ہے، کہ فارسی کلام مین بکثرت ایسے اشعار موجود ہین جن کے خیالات بعینہٖ اردو اشعار مین بھی نظم ہوئے ہین، اور یہ اردو اشعار عام طور پر مشہور ہین، دوسرے میر کا مخصوص قنوطی رنگ، دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا ذکر، محبت اور اس کے مختلف مدارج و منازل کا بیان، تصوف کے مسائل، ریاکاری اور سالوسی کی مذمت جیسی اردو کلام مین موجود ہے فارسی مین بھی ہے، اپنی برتری کا احساس، اپنی استادی کا یقین، اپنے کلام پر بھروسہ جس طرح ان کے اردو اشعار سے ظاہر ہے، فارسی سے بھی اسکی تائید ہوتی ہو، امور بالا کو پیش نظر رکھکر یہ خیال یقین میں بدل جاتا ہے، کہ پیش نظر فارسی کلام میر تقی میر کا ہے،

اس سلسلہ مین پہلے میر کے فارسی کلام سے بعض ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہین، جن کا خیال اردو اشعار مین بھی نظم ہوا ہے، اردو کا یہ شعر بہت مشہور ہی،

موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وہ نہین
کب درمیان سے وعدۂ دیدار جائیگا

اسی خیال کو کچھ بدل کر یون ادا کیا ہے :-

امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

فارسی مین یہی بنیادی خیال اس طرح نظم ہوا ہے،

ہر چند گفتہ اند کہ اے میر روز حشر
دیدار عام می شود امانمی شود،

اردو دیوان مین ایک شعر ہے،

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتوان سا کو بکو تھا

فارسی مین بھی بالکل اسی مضمون کو نظم کیا ہو :-

ندیدم میر را در کوے او لیک
غبار ناتوانے با صبا بود،

اسی اردو غزل میں ایک شعر معرفت کا ہے

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا ۔ جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

فارسی میں یہ شعر یوں ہے :-

گل و آئینہ و مہ و خورشید ۔ ہر کسے روبروے تو دارد

اسی غزل میں یہ شعر ہے :-

غلط تھا آپ سے غافل گذرنا ۔ نہ سمجھا میں کہ اس قالب میں تو تھا

اسی مضمون کو فارسی میں نظم کیا ہے :-

غلط کردم کہ رفتم (؟) از خود ۔ ندانستم و این قالب خدا بود

اردو کا یہ شعر بہت مشہور ہے :-

جس شعر پہ سماع تھا کل خانقاہ میں ۔ وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

فارسی میں اسی خیال کو اس طرح ادا کیا گیا ہے :-

دوش بر شعر ترے در رقص آمد جان ہا ۔ چون نظر کردیم بود آن شعر در دیوان ما

اردو میں ایک اور شعر ہے :-

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن ۔ ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسیں تھا

فارسی میں اس خیال کو زیادہ نزاکت سے ادا کیا ہے :-

بر سر ما بدم نزع رسیدی بعبث ۔ ما کجائیم؟ تو تصدیع کشیدی بعبث

اردو میں ایک مضمون اس طرح نظم ہوا ہے،

سب کھلا باغ جہان الا وہ حیران و خفا ۔ جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

فارسی میں یہ شعر یوں ہے،

دل غنچہ کدام گل غیر موسم است ۔ ہر چند می کنیم و لے وا نمی شود،

اردو:- سر نشین رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں ۔ رسم مسجد کے تئیں شیخ کو آیا نہ گیا

فارسی:- من چہ دانم راہ و رسم خانقاہ ۔ عمر من در خدمت میخانہ رفت

اردو:- آہوں کے شعلے جس جا اٹھے ہیں میر سے شب ۔ واں جاکے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

فارسی:- میر جائے کہ بہ نیران محبت می سوخت ۔ صبح دیدم بجا ماندہ و کف خاک آنجا

اردو:- اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی ۔ شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی،

فارسی:- دل میکشد بصحرا ہنگام کار آمد ۔ شوریست در سر من، شاید بہار آمد

اردو:- پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلہ پر پیچ و تاب ۔ شمع تک تو میں نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

فارسی:- سحر گہ بر سرِ پروانہ رفتم ۔ کف خاکستر گرے بجا بود،

اردو:- منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا ۔ پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہیگا

فارسی:- منعم اے خانہ خراب اینہمہ شوق تعمیر ۔ سالہا ساختہ جاہ و مکان آخر ہیچ

مذکورۃ الصدر مثالیں غالباً اس امر کی وضاحت کے لئے کافی ہیں کہ اکثر اشعار جو اردو دیوان میں موجود ہیں، فارسی کلام میں بھی شامل ہیں، اس کا اندازہ مشکل ہے کہ پہلے اردو شعر کہا یا فارسی، اور اس کا فیصلہ غالباً اس طرح کیا جا سکتا ہے، کہ دو متحد المضمون اشعار سامنے رکھے جائیں، اور ان میں سے جو بہتر ہو اسے نقش ثانی قرار دیا جائے، اسکی تفصیل آگے آتی ہے :-

میر کی فارسی شاعری کے مضامین

جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا ہے، فارسی دیوان میں بھی وہی مضامین نظم ہوئے ہیں، جن سے اردو میں کام لیا گیا ہے، ان میں میر کا سب سے محبوب مضمون دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری ہے، اور اس مضمون کو میر نے جس جس طرح نظم کیا ہے، اس کی نظیر کسی دوسرے اردو شاعر کے کلام میں مشکل سے ملے گی، فارسی کلام کے بھی چند اشعار دیکھئے جن میں اسی مضمون کو باندھا ہے،

میرؔ دنیا رہگذارے بیش نیست　　　آسمان گرد و غبارے بیش نیست

وقت آنکس خوش کہ گلزار جہان را دید و رفت　　　ہم چو گل بر بے ثباتیہاے خود خندید و رفت

وقت فرصت خنک آنکس کہ نگہ می دارد　　　آہ ازین عمر کہ چون آب روان درگزر است

پشتہ ریگے کہ مبني کاروانے بودہ میرؔ　　　گرد باد این بیابان رہ نوردی بودہ است

دوسرا موضوع جو میرؔ کو بہت عزیز ہے "یاس و حرمان" ہے، اس کا نمونہ یہ ہے:

بجمع ماتمیان حرفِ من اثر دارد　　　بہ بزمِ عیش نفہمد کسے زبانِ مرا

لب راگہے بخندہ نیا آلودہ ایم ما　　　تا بودہ ایم گریہ کنان بودہ ایم ما

بس کن اشعار ماتم دل میرؔ　　　بر نخوان واقعاتِ مقتل (؟) را

تیسرا موضوع جو غزل کی جان ہے، عشقیہ مضامین ہین، اور ان کے ادا کرنے مین بھی میرؔ کو ید طولیٰ حاصل تھا، چنانچہ علاوہ اردو کلام کے جس پر قبولِ عام اور شہرتِ دوام کی مہر لگ چکی ہی، ذیل کے فارسی اشعار بھی اسی شمار مین آتے ہین:

بیا اے میرؔ در راہ محبت خویش را گم کن　　　اگر خواہی کہ دریابی نشانِ بی نشانان را

بامیدے کہ عشق آتش زند بر جانِ غمناکم　　　بسانِ شمع یکجا کردہ ام رگہاے گردن را

خطر در عشق ہر گام است جان بیقرارم را　　　عجب راہ آہ پیش آمد دلِ نا کردہ کامم را

در عشق کس نگشت حریف نبرد ما　　　بر روے ما نیامدہ جز رنگِ زرد ما

زانچہ در دشت رفت بر مجنون　　　چہ خبر بود گئی محمل را

باب لطفش نیستم لیکن چون از راہ میرسم　　　بر درِ او دیر می مانم نمی دانم چرا،

چارۂ من دلربایان جملہ میدانند لیک　　　کس نمی گوید کہ من دانم نمیدانم چرا

اس کے بعد تصوف کے مسائل ہین،

بجویم ترا ہر کجا تا کجا　　　بجاے رسان جستجوے مرا

رفتہ شوق شو و دیر و حرم را بگذار　　　طوف کن میرؔ بہر در بسجود آمدہ را

گل و آئینہ و مہ و خورشید　　　ہر کسے رو بسوے تو دارد

اس قسم کے اشعار بھی بکثرت موجود ہین، جن مین میرؔ نے اپنے ذاتی واقعات اور اس زمانہ کے خاص حالات کی طرف اشارہ کیا ہی، مثلاً

ہمچو میرؔ آزردہ جائے دیر پیدا می شود　　　مغتنم دانید روزِ چند این درویش را

بر دون تسلی شدم ورنہ میرؔ　　　نہایت نبود آرزوے مرا

اپنے مذہب اور مشرب کی طرف بھی بعض اشعار مین اشارہ کیا ہی:

کس کما ہی بجہان ذاتِ علی را نشناخت　　　شیعہ مولا و نصیریش خدا می گویند

اس سلسلہ مین دو رباعیان بہت اچھی کہی ہین :-

اے ختمِ رسل چارہ ندارد دردم　　　بخشا ہی کہ جرم بے نہایت کردم
بر چہرۂ زرد خونم آید ہردم　　　یعنی کہ ز فرط شرم سرخ و زردم

کوتاہی اگر نمی کند عمر دراز　　　این مرتبہ میرؔ می روم سوے حجاز
انشاء اللہ نعرہ زن و گریان کنان　　　بر خاک مدینہ می نہم روے نیاز

میرؔ کے اس نایاب فارسی دیوان کے تذکرہ کو بعض اشعار اور رباعیات پر ختم کیا جاتا ہے؛

رباعیات

سنگم بسر از جورِ فلک می بارد　　　بر بستر آرام خسک می بارد
از چشمِ من آب شور آید ہردم　　　یعنی کہ ز گریہ ام نمک می بارد

دیدن برخت چشمے تری می خواہد　　　رفتن بہ رہت برگ سری می خواہد

من صید بیک تیر بلا کم بگذار (بگذار)؟ آماج تو بودن جگرے می خواہد

ہمدمے ہمنشین کہ با تو حرفے دارم در زیر فلک حال تنگرفے دارم

از حادثہ، می خورم شکستے ہر دم جرمم نبود جز اینکہ ظرفے دارم

عشق تا بکجا ز درد مژگان تر کن برخیز و فسانۂ محبت سر کن

شد روز غمت شام بسوزانی داغ اے میر چہ مردۂ چراغے بر کن

متفرقات

بردن تسلی شدم ورنہ میر نہایت نبود آرزوے مرا

جور و جفاست کار تو و من ز سادگی موقوف رحم داشتہ ام کار خویش را

وفاے گل اگر معلوم می شد نمی بستم درین باغ آشیان را

از دل من تا غمِ جانانہ رفت رونق سر تا سرِ آن خانہ رفت

آخر آخر بر دوکانِ می فروش ابرویم بہر یک پیمانہ رفت

من چہ دانم راہ و رسمِ خانقاہ عمر من در خدمتِ میخانہ رفت

نے سر شیخے نے چراغے نے گلے از سرِ خاکم چہ بیرحمانہ رفت

نیست شورِ میر در بازارہا غالباً از شہر آن دیوانہ رفت

این نہ پنداری کہ مردن موجب آسودن است (من) مرگ ہم یک منزل است از راہ بے پایان

جرعہ بر خاک میر خواہد ریخت یاد از ان مے کہ در سبو دارد

خواب امشب ہم بہ یاران شد حرام قصۂ غم میر باز آغاز کرد،

بارے تو خود بگو کہ چہ خواہی جواب گفت گر روزِ حشر با تو مرا رو برو کنند

عشق یارب چہ بلائیست کہ پیشش بجرم میرو و میر بجالے کہ گنہگار رود!

نوٹ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ مین بکثرت نوادر موجود ہین، موجودہ فہرست مین انکو اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ فہرست سے کتاب کا کچھ حال معلوم نہین ہوتا، الحمد للہ کہ اب ہر شعبہ کی توضیحی فہرست تیار ہونے پر یہ دقت رفع ہو جائیگی، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان مین سے بعض نوادر کو ضروری مقدمات کے ساتھ شائع کرایا جائے، اس سے ایک طرف یونیورسٹی کی شہرت اور دوسری طرف علم کی خدمت پوری طرح حاصل ہو سکتی ہے،

مہابت خاں کا باغ اور مقبرہ

از

جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے لاہور

شہر لاہور سے شالامار باغ کی طرف جانے والی جرنیلی سڑک پر باغبان پورہ کے قریب جنوبی سمت شاہی دتتوں کا ایک پرانا باغ واقع ہے، جس کے وسط میں ایک بہت بڑے چبوترے پر ایک قبر کا ٹوٹا ہوا سا نشان بھی ہے، مشہور ہے کہ یہ باغ مہابت خان کا ہے، اور قبر بھی اسی کی ہے،

لاہور کے قدیم مورخین میں مولوی نور احمد چشتی[1] اس باغ اور قبر کو زمانہ بیگ ولد غیور بیگ کابلی المخاطب بہ خانخانان مہابت خان ہفت ہزاری سے منسوب کرتے ہیں، مگر سید لطیف[2] یہ تو مانتے ہیں، کہ یہ باغ مہابت خان کا ہے، مگر انھیں یہ باور کرنے میں تامل ہے، کہ مہابت خان اس جگہ مدفون ہے، اور وہ بادشاہ نامہ کے حوالے سے لکھتے ہیں، کہ مہابت خان مذکور بمقام برہان پور راہئ ملکِ عدم ہوا، اس لئے لاہور میں کسی جگہ کو اس کا مدفن قرار دینا غلط ہے، ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے، کہ یہ قبر زمانہ بیگ مہابت خان کی نہیں ہے، چنانچہ مآثر الامراء میں ہے، کہ زمانہ بیگ مہابت خان نے بھگندر کی بیماری میں برہان پور کے مقام پر ۱۰۴۴ھ میں اس دنیاے فانی کو الوداع کہا، اور مرنے والے کی وصیت کے مطابق اس کے راجپوت جان نثاروں نے اُسے دہلی میں شاہ مردان علی مرتضیٰ کی قدم گاہ کے قریب دفن کیا،[1]

[1] تحقیقاتِ چشتی (زمانہ تالیف ۱۸۶۷ء) صفحہ نمبر ۶۶۰ تا ۶۶۲،

[2] لاہور (بزبان انگریزی سال تالیف ۱۸۹۲ء) صفحہ نمبر ۱۵۶،

یہ عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے مورخینِ لاہور جب بھی مہابت خان کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد مہابت خان زمانہ بیگ ہی ہوتا ہے، حالانکہ مہابت خان اس کا نام یا نام کا جزو نہ تھا، بلکہ عہد مغلیہ کے بہت سے دوسرے خطابات، خانخانان، آصف خان، وزیر خان، دلیر جنگ وغیرہ کی طرح مہابت خان بھی ایک شاہی خطاب تھا، اور زمانہ بیگ کی طرح دیگر امرا بھی مختلف زمانوں میں اس خطاب سے سرفراز ہوتے رہے، اس لئے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں، کہ زمانہ بیگ کے علاوہ اور کون کون سے مقربینِ بارگاہِ سلطانی کو یہ خطاب ملا، چنانچہ خود زمانہ بیگ کا فرزند مرزا لہراسپ[2] شاہ جہان کے پچیسویں سال جلوس میں مہابت خان کے خطاب اور پانچ ہزاری منصب سے سرفراز اور حاکمِ کابل مقرر ہوا، اور ۱۰۸۵ھ میں عالمگیر اعظم کے عہد میں امین آباد کے مقام پر اس دار فانی سے رخصت ہوا، اس کے علاوہ ایک اور مہابت خان محمد ابراہیم حیدر آبادی عالمگیری حاکم لاہور بھی تھے، جو اسی شہر میں ۱۰۹۹ھ مطابق ۸-۱۶۸۷ء میں راہئ ملکِ عدم ہوئے، اس لئے اگر برہان پور میں فوت اور دہلی میں دفن ہونے والے مہابت خان کے بجائے لاہور میں فوت ہونے والے مہابت خان سے اس باغ اور قبر کو منسوب کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اس ابراہیم مہابت خان کے حالاتِ زندگی یہ ہیں، محمد ابراہیم خان[3] حیدر آبادی ایک غریب الوطن ایرانی باکمال تھا، اُسے حصول معاش کی جستجو نے ابو الحسن قطب شاہ والی گولکنڈہ کے دربار میں پہونچا دیا، نصیبے نے یاوری کی، اور اوس نے اپنی قابلیت، چرب زبانی اور حاکم کی غریب پروری کی بدولت بلند مدارج حاصل کرلئے، سید مظفر کی معزولی کے بعد جب دکن کے

[1] مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۰۷ تا ۴۰۸، [2] مآثر الامراء جلد سوم ص ۵۹۰

[3] مآثر الامرا جلد سوم ص ۶۲۷ تا ۶۲۹،

مشہور بہ ہمن مادنا اور اکن سلطنت پر حاوی ہو گئے تو دربار گولکنڈہ مین تحریک وطنیت کو بہت فروغ حاصل
ہوا، اس دور مین تمام بڑے بڑے عہدون سے غیر ملکیون کو علٰحدہ کر دیا گیا، اور ان کی جگہ دکنیون
اور ہندوون نے لی، بادشاہ ان کے ہاتھ مین کٹ پتلی بن گیا تھا، مگر اس دور مین بھی ابراہیم خان کے
تدبر اور اسکی زمانہ شناسی کی بدولت اس کا طوطی اسی طرح بولتا رہا، اور تنہا یہی ایرانی تھا، جو
مادنا گردی مین بھی مخالفین کی چھاتی پر مونگ دلتا رہا، اور مادنا کو بھی اُسے خلیل اللہ خان پلنگ
خان کے خطاب سے سرفراز کرکے سالار عساکر گولکنڈہ کے عہدۂ جلیلہ پر متمکن کرنا پڑا، ان دنون
ابراہیم کا سجع نگین یہ تھا،

ز التفات پادشاہ و پنڈت روشن روان
گشت ابراہیم سر لشکر خلیل اللہ خان

اسی زمانہ مین اورنگ زیبی فوجین حدود بیجاپور مین سکندر سے نبرد آزما تھین، کہ حاکم
گولکنڈہ کی شامت آئی، اس نے اپنے حاجب مقیم لشکر شاہی کے نام خط لکھ مارا کہ بادشاہ اورنگزیب
نے سکندر شاہ کو یتیم جان کر آگھیرا ہے، اس کی امداد کے لئے ایک طرف سے ہمارا سپہ سالار
خلیل اللہ خان چالیس ہزار سپاہ کے ہمراہ حملہ آور ہوتا ہے، اور دوسری طرف سے راجہ سنبھا
بھی لشکر کے ہمراہ آتا ہے، دیکھین شہنشاہ کس کس کا مقابلہ کرتا ہے، اتفاقاً یہ خط عالمگیر
کے ہاتھ لگ گیا، وہ بہت برہم ہوا اور کہا ہم اس بندر نچانے والے سے اغماض کر رہے تھے،
لیکن جب کہ مرغی نے خود بانگ دے دی ہے تو اسکی سرزنش ضروری ہے، اور بیجاپور کی مہم
مین مشغولیت کے باوجود ستائیسوین سال جلوس کے اواخر مین شاہ عالم اور خان جہان
کوکلتاش کو اوس کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا، ابراہیم خلیل اللہ خان نے لشکر شاہی کو روکنے کی
بہت کوشش کی، مگر آخر کار شکست کھا کر بھاگ نکلا شاہزادے نے شکست خوردہ فوج کا

تعاقب نہ کیا، اور وہ بخیریت حیدرآباد پہونچ گیا، عالمگیر کو اس کی اطلاع ہوئی، تو اُسے شاہزادہ
کی اس غلطی کا بڑا افسوس ہوا، کہ اس نے شکست خوردہ فوج کو نکل جانے دیا،

شاہزادے نے باپ کے خوف سے ابراہیم کو لکھ بھیجا کہ تمھاری فوج کے تعاقب نہ کرنے
کے جرم مین عتاب سلطانی کا خوف ہے، اس لئے قبل اسکے کہ بادشاہ کی جانب سے حیدرآباد
کی مہم دوبارہ جاری کرنے کے متعلق کوئی حکم صادر ہو، تم سیرم اور کوسیر کے علاقے ہمارے حوالہ
کردو تاکہ اس کے صلہ مین شہنشاہ سے معافی حاصل کر لی جائے، ابراہیم اورنگ زیبی بہادرون
کی تیغ زنی کے جوہر دیکھ چکا تھا، اس لئے اس تجویز پر رضامند ہو گیا، لیکن مادنا کے ناعاقبت اندیش
چچازاد بھائی رستم راؤ نے جسے انانیت، کبر اور طاقت کے زعم نے اندھا کر رکھا تھا، اس تجویز کو پائے
استحقارت ٹھکرا دیا، اور کہلا بھیجا کہ یہ پرگنے ہمارے نیزے کی نوک سے بندھے ہین ہمت ہے تو
لے لیجئے، اس تعلی کا نتیجہ افواج حیدرآباد سے جنگ اور اوس کی شکست کی صورت
مین ظاہر ہوا، مادنا کی پارٹی تو پہلے ہی ابراہیم سے جلی ہوئی تھی، اور اس تاک مین تھی کہ اس ایرانی کو
بھی دوسرے غریب الوطنون کی طرح معزول کرنے کے لئے کوئی بہانہ ہاتھ آئے، شکست کی ندامت
اور ابراہیم کی دشمنی نے اس الزام کی صورت دیدی کہ ابراہیم عالمگیر سے سازباز کر رہا ہے، اور
اس کی ملازمت اختیار کرنا چاہتا ہے، اور مادنا نے شاہ گولکنڈہ سے ابراہیم کی گرفتاری کا حکم
حاصل کر لیا، اب ابراہیم کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ گیا کہ وہ اورنگزیب کے دامن
مین پناہ لے، چنانچہ وہ شاہ کی فوج سے جا کر مل گیا، اور شہنشاہ کے حکم سے مہابت خان کے خطاب
اور چھ ہزاری منصب سے نوازا گیا، یہ صاحب مآثر الامراء کا بیان ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ ابراہیم
شہزادے سے صلح کرنا چاہتا تھا، اور دوبارہ جنگ رستم راؤ کی حماقت سے ہوئی، اسلئے ابراہیم
نے بذریعہ خط و کتابت یہ صورت حال شہزادے کے گوش گذار کر دی ہو، نیز دربار حیدرآباد

کی بے راہ روی اور سفلہ گردی سے تنگ آکر عالمگیری دربار مین اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہو، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہو کہ شاہزادہ کے حضور مین حاضر ہوتے ہی اس پر انعام و اکرام کی بارش شروع ہو گئی، ابراہیم نے اسی سال شولاپور مین بارگاہ خسروی مین باریاب ہو کر سعادتِ آستان بوسی حاصل کی، اور ۵۰ ہزار نقد روپیہ کے علاوہ دیگر انعامات سے مالا مال ہوا، اکیسوین سال جلوس مین حیدرآباد کی فتح کے بعد ہفت ہزاری امرار کے زمرے مین جگہ پائی، اور صوبہ لاہور کا حاکم مقرر ہوا،

ابراہیم کی عمر کا زیادہ حصہ دکن ہی مین گذرا تھا، اور اب پیرانہ سالی مین اسے باہر جانے کا موقع ملا، اس لئے وہ قابلِ دید مقامات، پر رونق قصبات اور پُر شوکت عمارات کی سیر کرتا، اور دورِ مغلیہ کی تہذیب و تمدن کے مظاہر سے آنکھون کو ٹھنڈک پہنچاتا، اپنے لاؤ لشکر اور متوسلین کے ہمراہ آہستہ آہستہ عازمِ پنجاب ہوا، اور ہندوستان جنت نشان کے جنگلون، پہاڑون، میدانون اور شہرون سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا،

اس دلچسپ سفر کے صرف دو افسوسناک واقعات تاریخون مین ملتے ہین، ان مین سے ایک ابراہیم کی بہادری کا ثبوت ہو، اور دوسرا عاقل رازی کی بد دماغی کا،

اسکی تفصیل یہ ہو کہ دہلی اور آگرہ کے اردگرد ہندو جاٹ آباد ہین، ان لوگون کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا ہو کہ جب تک حکومت مضبوط رہی، تو وہ ڈنڈے کے ڈر سے دبے رہے، اور جہان حکومت کمزور نظر آئی، یا بادشاہ کسی مہم مین مرکز سے دور ہوا، تو یہ بھی مفسد شورش اور غارت گری پر اتر آئے، چنانچہ عالمگیری دور مین بھی جب کہ بادشاہ دکن مین مرہٹہ فتنہ کو جسے وہ شاہانِ دکن کی امداد سے قیامت بنانا چاہتے تھے، فرو کرنے مین مشغول تھا، جاٹون کو فتنہ پردازی کا موقع مل گیا، اور انھون نے قلب ہندوستان مین شورش بپا کر دی،

جاٹون کی غارتگری کا طریقہ وہی تھا جو اٹھارہوین صدی عیسوی کے آخری ربع مین پنجاب مین

سکھون نے اختیار کیا تھا یعنی مختلف گروہ اپنے سردارون کی ماتحتی مین موقع پا کر کسی مقام پر حملہ کر دیتے، اور لوٹ مار اور قتل و غارت کر کے اپنی راہ لیتے، چنانچہ جب ابراہیم مہابت خان کا قافلہ سکندرہ کے قریب خیمہ زن ہوا تو جاٹون کے ایک گروہ نے مال کی لالچ مین حملہ کر دیا، ابراہیم ایک تجربہ کار اور نبرد آزما بہادر تھا اس نے پوری شجاعت سے اس کا مقابلہ کیا، اور چار سو باغیون کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا،

دوسرا واقعہ یہ ہو کہ شمالی ہندوستان مین ابراہیم مہابت خان کا یہ پہلا سفر تھا، اس لئے راہ کے تمام نوادر کی سیر بھی اسکے پروگرام مین شامل تھی، چنانچہ اوس نے دکن سے روانہ ہونے سے قبل شہنشاہ سے قلعہ دہلی دیکھنے کی اجازت حاصل کر لی تھی، اور عاقل خان رازی میر عسکری حاکم دہلی کے نام شاہی حکم جاری ہو گیا تھا کہ ابراہیم مہابت خان کو پورے اہتمام سے دولت خانۂ خسروی، قلعۂ دہلی، اور دوسری شاہی عمارتون کی سیر کرائی جائے، عاقل نے اس حکم کے جواب مین لکھا، کہ اول تو ابراہیم حیدرآبادی اس لائق نہین کہ اسے شاہی عمارات کی سیر کرائی جائے، دوسرے بادشاہ کے دہلی مین نہ ہونے کی وجہ سے شاہی محلات کے دروازے بند ہین، اور صفائی ہونے والی ہے، اور انھین بغیر فرش و فروش اور ساز و سامان کے دیکھنا عبث ہو، نیز ابراہیم کا یہ رتبہ نہین ہے، کہ محض اوس کے دیکھنے کے لئے محلات کی صفائی کرائی جائے، پھر ممکن ہو کہ دورانِ ملاقات مین اوس کے ساتھ میری جانب سے وہ سلوک نہ ہو سکے، جس کا کہ وہ مجھ سے متوقع ہو سکتا ہے،

اسلئے ابراہیم خان کو شاہی محلات کی سیر کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے، عاقل خان رازی بد دماغ اور متکبر ہونے کے باوجود اپنی پرانی خدمات کی بنا پر شہنشاہ عالمگیر کا بہت منہ لگا ہوا تھا، اور شہنشاہ اپنی طبیعت کے خلاف محض اس کے خدمات کی وجہ سے اوسکی ناشایستہ حرکات سے بھی چشم پوشی سے کام لیتا تھا، اس لئے اس بار بھی یہی ہوا،

---

[1] اطالوی سیاح منوچی کا سفرنامہ سٹوریا ڈو موگر (مترجمہ ولیم اروِن) جلد دوم صفحہ ۳۲۰ [2] مآثر الامرا جلد دوم ص ۸۲۶

چنانچہ دہلی پہونچنے کے بعد بھی ابراہیم خان نے کئی پیغام بھیجے، مگر اوس کے پیہم اصرار کے باوجود ادھرسے انکار ہی ہوتا رہا،

عاقل خان کی اس بد دماغی اور بداخلاقی پر پیچ و تاب کھاتا ہوا ابراہیم مہابت خان لاہور کی سمت روانہ ہوا، اور لاہور پہونچکر اپنے جلیل القدر عہدے کا چارج لیا، ان دنون شہر لاہور سلطنت مغلیہ کے چوٹی کے شہرون مین شمار ہوتا تھا، اور اس صوبے کے حاکم اعلیٰ کا درجہ بہت بلند ہوتا تھا، مگر ابراہیم کی قسمت کہ ابھی اسے لاہور آئے ہوئے پورا ایک برس بھی نہ گذرا تھا، کہ اس کا پیام اجل آگیا اور وہ سنہ ۱۰۹۹ھ مین راہی ملک بقا ہوا، اورنگ زیب عالمگیر کے ایک رقعے[1] مین بھی مرقوم ہی کہ

مہابت خان حیدرآبادی ظاہرا در لاہور در گذشت و غیر از نبیرہ کہ پدرش بحضور پدر رحلت کردہ ورثہ دیگر ندارد، بدیوان بیوتات آنجا بنگارد کہ ......"

گو مآثر الامرا یا کسی اور قدیم کتاب مین یہ نظر سے نہین گذرا کہ ابراہیم خان کو لاہور مین سپرد خاک کیا گیا، مگر لاہور کے علاوہ اسے لیجانا بھی کہان تھا، ایران کو خیرآباد کہے مدت گذر چکی تھی، حیدرآباد سے کوئی تعلق نہین رہ گیا تھا، اس وقت تو لاہور ہی ابراہیم مہابت خان کا مسکن تھا، اس لئے اغلب گمان یہی ہے کہ وہ لاہور ہی کی خاک مین دفن کیا گیا، اور شہر لاہور مین ایک مزار کا مہابت خان کے نام سے منسوب ہونا اس امر کا ثبوت ہی کہ وہ ابراہیم مہابت خان حیدرآبادی ہی کا مرقد ہے'

اس سلسلہ مین یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے، کہ یہ قبر ایک بہت بڑے چبوترے پر باغ کے وسط مین ہی اور یہ باغ مہابت خان کا باغ کہلاتا ہے، اور شہر لاہور مین ابراہیم حیدرآبادی کے قیام کا زمانہ ایک سال بھی پورا نہین، اس لئے ابھی جب کہ وہ یہان سے پوری طرح مانوس اور واقف بھی نہ ہوا ہوگا، اس کا ایک باغ بھی تعمیر کرا دینا خلاف حقیقت معلوم ہوتا ہے، مگر اس اعتراض کا کوئی

[1] رقعات عالمگیری (نولکشور ایڈیشن) رقعہ نمبر ۱۴۵،

وزن نہین ہے، کیونکہ یہ باغ چندان بڑا نہین ہے، اور نہ اس کے متعلق کوئی خاص عمارتین ہین جن کی تعمیر کے لئے زیادہ وقت کی ضرورت درکار ہو، اس زمانہ کے امرا مین عمارات کے ساتھ باغ لگوانے کا عام دستور تھا، اس لئے ممکن ہی کہ مہابت خان نے اسکی داغ بیل ڈلوائی ہو، اور اس کی زندگی مین اسکی تکمیل نہ ہو سکی ہو، اور اس کے دفن ہونے کے بعد تکمیل کی گئی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اسکی قبر کے متعلق عمارتین اور باغ بنوا دیا گیا ہو، کیونکہ اس عہد کے امرا مین اس کا بھی دستور تھا، اور اس قبیل کی بہت سی عمارتین اور باغات لاہور مین موجود ہین، مثلاً نواب میان کا مقبرہ اور باغ یا مرزا سلطان بیگ کا باغ و مقبرہ جو ابھی کم شکستہ حالت مین موجود ہین، یہ اور اس قسم کے بہت سے آثار قدیمہ جن مین مسجدین، مدرسے، حمام، باغ اور عہد مغلیہ کی بہت سی تمدنی یادگارین تھین، سب پنجاب کی طوائف الملوکی کے دور مین برباد ہوگئے،

دست برد زمانہ سے چند عمارات بچ گئی تھین، ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی، باغات اجڑ گئے تھے، ان مین کھیتی باڑی ہونے لگی، بہتون مین زمیندار آباد ہو گئے، کیونکہ باغات کی بلند اور مضبوط دیوارین اس بدامنی کے دور مین ان کے مال و متاع اور ننگ و ناموس کی حفاظت کے لئے سد سکندری کا کام دیتی تھین، اس باغ کا بھی یہی حال تھا، محمود نام کوئی زمیندار اس پر قابض تھا، سنہ ۱۷۹۹ء مین رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت قائم کی، اور کچھ عرصے کے لئے پھر امن و امان ہو گیا، مگر عہد مغلیہ کی پرانی یادگارون کے لئے یہ پرامن دور بھی قیامت آفرین تھا، اینٹ اور پتھر کی لالچ نے بیسیون نادر روزگار عمارتون کو برباد کر دیا، حکومت کا بھی انکی بربادی مین بڑا ہاتھ ہی، تقریبًا تمام بڑی بڑی عمارتین حکومت کے تصرف مین تھین، رنجیت سنگھ نے جہان مسجدون مقبرون اور سراؤن کو گولہ بارود اور دیگر سامان حرب کا گودام بنایا وہان باغات کا مصرف یہ لیا کہ شالامار کو تو اپنے ذاتی استعمال کے لئے آراستہ و پیراستہ کیا، اور دوسرے باغات کو امرا اور اعیان دولت مین تقسیم کر دیا، جس کو وہ اور ان کے اخلاف نہ سنبھال سکے، مہابت خان کا باغ فقیر عزیز الدین

کو ملا تھا، ۱۸۶۶ء کے قریب فقیر صاحب کے وارثون نے یہ باغ نوسو روپیے مین پارسی سوداگرون کے ہاتھ فروخت کر دیا، انھون نے اسکی درستی اور آراستگی کی طرف توجہ کی، اور پارسیون کی رہائش کے سبب اس باغ کا نام "پارسیان والی باغیچی" زبان زد ہو گیا، کچھ دنون کے بعد پارسیون نے اسے باغبان پورہ کے مشہور "میان خاندان" کے رؤسا کے ہاتھ فروخت کر دیا، اس لئے یہ باغ بھی لاہور کی اکثر قدیم اسلامی یادگارون کی طرح محکمۂ آثار قدیمہ کی نگرانی مین نہین ہے، باغ کی موجودہ کیفیت یہ ہے کہ اسکے چارون طرف ایک بلند خشتی دیوار ہے اور جانب شمال لب سڑک اندر جانے کا دروازہ ہے اس کا شاندار صدر دروازہ مغرب جانب ہے جو اب بند رہتا ہے، اسکے اوپر ایک دو منزل پارسیون نے اپنے زمانہ قیام مین بنوائی تھی، چار دیواری کے اندر درمیان مین ایک شکستہ سا بہت بڑا خشتی تھڑا ہے، جس پر چڑھنے کی سیڑھیان جنوب کی طرف ہین، تھڑے پر گھاس اور درخت اُگ رہے ہین، شمالی جانب درخت زیادہ ہین، اس کے وسط مین تین اینٹ بلند ایک اور چھوٹا سا چبوترہ ہے، جو درمیان مین کچا ہے،

یہان مہابت خان کی قبر تھی جو امتداد زمانہ سے بٹ چکی ہے، اور زبانِ حال سے یہ مرثیہ سنا رہی ہے کہ

گذشتہ عرش نشینون کی یادگار ہے یہ
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہے یہ

باغ کے مشرقی جانب کے آدھے حصہ مین کھیتی باڑی ہوتی ہے، اور بقیہ حصہ مین بہت سے درخت اور گھاس پھوس ہین، مغربی جانب کے صدر دروازہ کے بالمقابل مشرقی جانب بھی جواب مین غالباً کوئی عمارت تھی، جس کے آثار نمایان ہین، ممکن ہے باغ مین کچھ اور عمارتین بھی رہی ہون، جن کا نشان اب مٹ چکا ہے، چار دیواری کے اندر کی زمین دو بیگہ سوا تین کنال ہے، جنوبی سمت کی دیوار مین جانب مغرب پہلے دو کوٹھریان اور ایک بڑا دالان نما کمرہ ہے اور

اس کے بعد ایک چھوٹی سی عجیب مسجد ہے، جو اندر کی جانب سے محض باغ کی دیوار معلوم ہوتی ہے، باغ کے ایک دروازے کے ذریعہ مسجد کے صحن مین جاتے ہین، مسجد کا صدر دروازہ جانبِ شرق باغ سے بالکل علٰحدہ ہے، اور داہنے ہاتھ قبلہ رو مسقف حصہ ہے، مسجد کے ایک کونے مین ایک بہت بڑا قدیم مگر مرمت شدہ کنوان ہے، مسقف حصہ پر ڈھلوان گنبد ہے، اسکے آگے کا برآمدہ، فرش صحن، دروازہ، وضو کرنے کی ٹوٹیان اور غسل خانے نو تعمیر ہین، پہلے اس مین ایک حوض تھا، مگر اب بند ہو چکا ہے، مسجد آباد ہے، اور اس مین بجلی بھی لگی ہوئی ہے، برآمدے کی سیاہ رنگ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۱۳۵۰ھ مین میان محمد شاہنواز ولد میان ظہور الدین صاحب کی والدہ (یعنی پنجاب کی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی نامور خاتون جہان آرا بیگم شاہنواز صاحبہ کی ساس) نے مسجد کی مرمت کرائی تھی، مسجد ایک پر فضا مقام ہے، اور چونکہ باغ کے قرب وجوار مین نئی آبادی ہو گئی ہے، اس لئے مسجد مین نماز کے وقت کچھ نمازی بھی آجاتے ہین

یکم رمضان مطابق ۱۳ ستمبر ۱۹۴۳ء کو مین اس مضمون کی تحریر کے دوران مین اس باغ کو دیکھنے کیلئے گیا تھا، معلوم ہوا کہ فروری سے باغبان پورہ کی انجمن تبلیغ الاسلام کے زیر اہتمام ایک مکتب باغ کے ملحقہ دالان مین جاری ہے، جسمین پچاس کے قریب لڑکے پڑھتے ہین، مدرسہ مین دو استاد ہین، جنمین سے ایک مسجد کی امامت کے فرائض بھی انجام دیتا ہے، بچون کو ابتدائی حساب، اردو زبان، قرآن شریف اور ابتدائی اسلامی مسائل کی تعلیم دیجاتی ہے،

باغ کی فصیل، دروازے اور دالان نیم شکستہ حالت مین اہلِ بصیرت کو عبرت دلا رہے ہین، کیسے معلوم ہے کہ اس ویرانے مین خودرو گھاس اور جھاڑیون کے درمیان مٹی اور اینٹون کے ڈھیر کے نیچے شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے عہد کا ایک ہفت ہزاری امیر اور لاہور کا سابق گورنر محو خواب ہے اور آج اوسکی مٹی ہوئی قبر کے نشان پر کوئی فاتحہ خوان بھی نہین آتا،

دورِ گردون را بیک حالت نمی باشد قیام
گاہ گردد صبح روشن رو نماید گاہ شام

استدراکات بر مقالہ صفی ہندی

(۱)

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد

صفر ۱۳۶۳ھ (کذا) کا معارف ابھی ابھی وصول ہوا، آپ کے دلچسپ مضمون کے ص ۸۵، اپر صفی ہندی کی تالیف نمبر ۴ کے لاپتہ ہونے کا ذکر ہے، لیکن بروکلمان نے ضمیمہ تاریخ ادبیات عربی ج ۲ ص ۱۴۳ مین لکھا ہی کہ یہ رسالہ جس کا نام الرسالۃ التسعینیۃ فی الاصول الدینیۃ ہی تونس کی جامع زیتونہ (فہرست ج ۳ ص ۳۱ نمبر ۱۳۴) نیز مکتبہ ملکیہ قاہرہ (فہرست ۱۷۔ ص ۳۹۰) مین موجود ہے،

بروکلمان کے ماخذون مین شوکانی کی البدر الطالع ج ۲ ص ۸۰، و مابعد کا بھی ذکر ہی، جو بظاہر آپکے پیش نظر نہین ہین،

معارف: آپ کی توجہ فرمائی کا شکریہ، افسوس ہی کہ اتفاق سے بروکلمان کی یہ کتاب یہان اس مقالہ کی تسوید کے وقت موجود نہ تھی، جامعہ زیتونیہ تیونس کی فہرستون مین سے صرف تاریخ سے متعلق جلدین یہان موجود ہین، نیز کتب خانہ خدیویہ مصر کی فہرستین تو ہین، مگر مکتبہ ملکیہ قاہرہ کی فہرست سے ہمارا کتب خانہ خالی ہے، ہم آپکے شکر گذار ہین کہ ان ماخذ مین آپنے صفی ہندی کے اس رسالہ کا سراغ لگایا،

شوکانی کی البدر الطالع تو مقالہ کی تسوید کے وقت پیش نظر رہی تھی، مقالہ مین اس کا تذکرہ بھی آیا ہے، ملاحظہ ہو معارف ج ۵۱ نمبر ۳ صفحہ ۱۶۶ :-

"علامہ شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ نے البدر الطالع مین ان کو جگہ دی ہے، مگر ابن تیمیہ کے مقابلہ کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ انصاف کو قائم نہ رکھ سکے ہین"۔

پھر ایک دوسرے موقع پر ص ۸۰ کے حاشیہ مین ہے:-

"....... البدر الطالع جلد ۱ ص ۶۶، ۶۷...... علامہ شوکانی نے شیخ صفی الدین کے ترجمہ (جلد ۲ ص ۱۸۷، ۱۸۸) مین ان کے ان مزاحیہ فقرون کے دوسرے معنی پہنائے ہین، جو حقیقت سے دور ہین، نیز ابن تیمیہ سے ان کے اختلاف کے سبب سے شیخ صفی الدین کے سوانح مین ان کا لب و لہجہ بھی اچھا نہین رہا ہے"۔

"س"

(۲)

از مولانا محمد بدر الدین صاحب علوی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

معارف ماہ مارچ ۱۹۴۳ء مین ایک طویل مقالہ صفی ہندی کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس کے ذریعے ساتوین آٹھوین صدی ہجری کے ایک مشہور و ممتاز ہندوستانی عالم کو جو خود ہندوستان مین غیر معروف ہین، روشناس کرکے ایک عمدہ خدمت انجام دی گئی ہی، اس مقالہ مین اُس مناظرے کا بھی ذکر ہے جو صفی ہندی اور ابن تیمیہ کے درمیان ہوا تھا، مگر مناظرے کا نتیجہ اس عذر کے ساتھ ترک کر دیا گیا ہے، "نتائج کی ایک طویل داستان پیش آئی، جس سے ہمین اس موقع پر کوئی سروکار نہین"۔

مگر میرے خیال مین ایسے عظیم الشان مناظرے کا نتیجہ نہ لکھنا واقعہ نگاری کے لحاظ سے بڑی کمی ہی، خصوصًا جبکہ اس مین ذرا بھی طول نہ ہو، اور خود قدیم واقعہ نگار مختصر الفاظ مین اس کو لکھ چکے ہون، چنانچہ اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ سطور تحریر کی گئی ہین، اور اسی لئے بجائے اپنی طرف سے کچھ کہنے کے خود حافظ ابن حجر کے الفاظ مین نتیجے کا ذکر کیا جا رہا ہی، (ملاحظہ ہو الدر الکامنہ جلد اول ص ۱۴۵ تذکرہ ابن تیمیہ)

ثم انفصل الامر علی انہ شہد علی   پھر معاملہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ انھون نے خود

نفسه انه شافعی المعتقد فاشاع
اتباعه انه انتصر فغضب خصومه
ورفعوا واحدا من اتباع ابن تیمیة
الی الجلال القزوینی نائب الحکم
بالعادلیة فعزره،

یہ اقرار کرلیا کہ وہ امام شافعی کا عقیدہ رکھتے
ہیں، اب ان کے اتباع نے یہ مشہور کیا کہ وہ
غالب آگئے، اس پر ان کے مخالفین برہم ہوئے،
اور ابن تیمیہ کے پیروؤں میں سے ایک کو جلال
قزوینی نائب حاکم عادلیہ کے سامنے پیش کیا،

معارف:- آپ نے ابن تیمیہ کے سوانح سے جو عبارت نقل کی ہے، وہ ظاہر ہے کہ ایک وقتی بات ہے، اور تا وقتیکہ تمام امور سامنے نہ رکھے جائیں، اس فیصلہ پر روشنی نہیں پڑ سکتی، اس کے بعد بہت سے واقعات پیش آئے، یہاں تک کہ علامہ ابن تیمیہ ایک سے زیادہ مرتبہ قید کئے گئے، اور قید ہی کی حالت میں انھوں نے وفات پائی، جو عبارت آپ نے نقل فرمائی ہے، ملاحظہ فرمائیں کہ اسی سے متصل ساری داستان اس میں یکجا بیان کی گئی ہے،

ان واقعات کا تعلق دراصل سیرتِ ابنِ تیمیہ سے ہے نہ کہ شیخ صفی ہندی سے، اس لئے صفی ہندی کے سیرت نگار کے لئے ان میں ہاتھ لگانا دراصل موضوع سے باہر جانا تھا، اس سلسلہ میں شیخ صفی ہندی کا تعلق بس اسی قدر ہے کہ وہ اپنی سربرآوردگی کے باعث مناظرہ کیلئے آگے بڑھائے گئے، اسلئے انھوں نے مناظرہ میں جو کچھ حصہ لیا اسکا تعلق انکی سیرت سے پیدا ہوجاتا ہے، اسکے بعد وہ بیٹھ گئے، مجلسِ مناظرہ قائم رہی، اور ایک دوسرے صاحبِ علم علامہ ابن تیمیہ سے مناظرہ کرتے رہے، مناظرہ کے ختم ہونے کے بعد عوام میں ہیجان پیدا ہوا، حکومت نے عام منادی کرائی، کہ جو شخص عقائد پر گفتگو کرتا ہوا پایا جائے گا، اسے اس قسم کی سزا دیجائیگی، اور اس کے بعد مزید حالات پیش آتے گئے، مقالہ صفی ہندی میں آپنے یہ عبارت ملاحظہ فرمائی ہوگی

"اسکے بعد کے نتائج (دربیضیہ تمیم) کی ایک طویل داستان پیش آئی جس سے ہمیں اس موقع پر کوئی سروکار نہیں"

اس عبارت میں "نتائج" سے اشارہ انہی واقعات کی طرف تھا، اور یہ ظاہر کر دینا تھا کہ ان امور

ﮯ اردو ترجمہ کی ذمہ داری مجیب پر ہے،

کا تعلق شیخ صفی ہندی کے سوانح حیات سے نہیں ہے، بلکہ یہ ابن تیمیہ کے سوانح حیات کے اجزا ہیں، البتہ آپ جیسے اہلِ علم کے لئے جو اس موقع پر مزید معلومات کے مطالعہ کے خواہشمند ہوسکتے تھے، انھیں تلاش کی زحمت سے بچانے کیلئے ماخذ کا حوالہ دیدیا گیا تھا، چنانچہ اسی موقع پر حاشیہ میں حسب ذیل تصریح کردی گئی تھی کہ

"اس مناظرہ کی تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو، الدرر الکامنہ ترجمہ ابن تیمیۃ البدر الطالع جلد ا ص ۶۶،

ترجمہ ابن تیمیہ، نیز ابن تیمیہ کے دیگر تراجم" (معارف ماہ مارچ ۱۹۴۳ء ص ۱۷۰)

چنانچہ آپ نے مذکورۂ بالا عبارت الدرر الکامنہ تذکرہ ابن تیمیہ ہی سے پیش فرمائی ہے، اگر آپکے مشورہ کے مطابق صرف اسی قدر اس فیصلہ کو لکھ دیا جاتا، تو اوّلاً وہ تسلسلِ واقعات کے اعتبار سے ناتمام ہوتا، علاوہ ازیں یہ علامہ ابن تیمیہ کے ساتھ انصاف بھی نہ ہوتا، چنانچہ آپ خود علامہ ابنِ حجر کی روش سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انھوں نے اس فیصلہ اور مابعد کے واقعات کا کوئی تذکرہ شیخ صفی ہندی کے سوانح میں نہیں کیا، اور چونکہ یہ ابن تیمیہ کے سوانح کے اجزا تھے، اس لئے اس موقع پر انھوں نے تفصیل سے لکھا، گویا صفی ہندی کے مقالہ نگار نے بھی علامہ ابن حجر کی پیروی کی ہے، اور شیخ صفی کے سوانح میں اسی حد تک واقعات لئے جس حد تک ان کے سوانح سے متعلق ہوسکتے تھے، البتہ مقالہ نگار نے ربطِ کلام کے لئے آخر میں مقالہ کے متن میں بعد کے نتائج کی طرف اشارہ کر دیا، اور تفصیل چاہنے والوں کے لئے حاشیہ میں ان ماخذ کا حوالہ ثبت کر دیا،

امید ہے کہ اس تصریح سے مقالہ نگار کا نقطۂ نظر آپ پر واضح ہوگیا ہو، بہرحال اگر آپکے نزدیک اس مرسلہ ٹکڑے کی اشاعت بھی ضروری تھی، تو حسبِ ارشاد اس "استدراک" کی اشاعت سے آپ کے نقطۂ نظر کے مطابق وہ کمی بھی پوری ہوگئی،

"س"

استفسار و جواب

سلطان شہاب الدین کے قاتل، مقتل، مرقد؟

اور

چند دوسرے استفسارات

جناب محمد اسلم خان صاحب
(بکمراله ضلع جہلم)

جناب نواب امتیاز الدین سپرنٹنڈنٹ پولیس ضلع جہلم کو تاریخ سے انس ہی، اپنے مختصر قیام ملازمت مین ضلع کے اکثر تاریخی مقامات کا بچشم خود ملاحظہ کیا ہی، اسی شوق نے اونھین سلطان شہاب الدین محمد غوری مرحوم کے مقتل کو بمقام دھمک جو سوادہ اسٹیشن سے بجانب شمال ۳ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤن ہی، دیکھنے پر مجبور کیا، وہان جن لوگون کی معیت مین آپ تشریف لے گئے تھے، وہ تاریخ سے قطعًا نابلد ہین، انھون نے آپ کو سلطان موصوف کی قتل گاہ بتانے کے بعد مرحوم کی تربت بھی دکھائی، کہ یہان موصوف کو دفن کیا گیا ہی اور سلطان کے قاتل گکھڑون کو ظاہر کیا گیا، اس دورہ کے بعد نواب صاحب نے ایک مقالہ اخبار نئی زندگی مین جو جہلم سے شائع ہوتا ہی شائع کرایا، اور ڈپٹی کمشنر صاحب کی معرفت محکمۂ آثار قدیمہ کی توجہ کو اس قبر کی طرف منعطف کرانے کی کوشش کی کہ اس دیرینہ

یادگار کو محفوظ کرنا ازبس ضروری ہی، اب اکثر تعلیمیافتہ اصحاب اس داستان کو صحیح تسلیم کرتے ہین، اس لئے آپ ازراہ کرم ایک مقالہ معارف مین شائع کرین، کہ

(الف) سلطان شہاب الدین مرحوم کو کس نے شہید کیا، فرشتہ نے گکھڑ قوم کی نسبت غلط بیانی سے کام لیا، ہی یا تو دیدہ و دانستہ ایسا کیا گیا یا اوسے غلط فہمی ہوئی، اسکی تصحیح بھی لازمی ہی؛

فرشتہ کا بیان ہی کہ سلطان محمود کے ساتھ کفار گکھڑون نے مقابلہ کیا، جس سے سلطان کی بے شمار فوج ماری گئی، سلطان شہاب الدین کو قتل کیا، لیکن گکھڑون کے ایک ممتاز فاضل شخص کا بیان ہی کہ گکھڑون نے نہ سلطان کا مقابلہ کیا، نہ شہاب الدین مرحوم کو قتل کیا، بلکہ خود سلطان محمود غزنوی کی معیت مین ہندوستان مین داخل ہوئے یہ قوم کیانی النسل ہے، بلکہ قوم کھوکھر نے سلطان کا مقابلہ کیا، فرشتہ کو مغالطہ ہوا،

(ب) شہید کرنے کی وجہ کیا ہی:-

(ج) نیز سلطان موصوف کا مرقد کہان ہی؛

(د) ہمراہی کس قدر تھے جو قتل ہوئے،

(ه) یہ واقعہ قتل کس مقام پر ہوا، کیا اس کا تاریخی نام دھمک ہی،

حضرت والا! براہ عنایت مندرجۂ ذیل چند سوالات کا جواب بھی تسلی بخش طور پر عنایت فرما کر مشکور فرمائیں،

(۲) قوم گکھڑ کی اصل کیا ہے، کیا یہ کیانی النسل ہے، یا ہندوستانی الاصل،

مسٹر ٹالبٹ صاحب مہتمم بندوبست گزیٹیر ضلع جہلم ۱۹۰۴ء مین رقمطراز ہین کہ اکبر نامہ اور اقبال نامۂ جہانگیری مین تحریر ہے، کہ گکھڑ ہندوستان میں سلطان محمود کی معیت مین داخل ہوئے، اور کیانی النسل ہین، اگر وہ اقتباس فارسی کی محولہ بالا کتابون کا تحریر فرما دین تو کرم ہوگا، اور ساتھ ہی یہ تحریر فرما دین کہ ان کے پاس کیا سند ہے،

(۳) (الف) ترک، کیانی، مغل، تاتاری، کیا چارون قومین ایک ہی اصل سے ہین، یا علحدہ علحدہ ہین،

(ب) ان سب مین معزز کون ہو اور کس لحاظ سے،

(۴) بعض مورخین نے فی صدی تین پشتین شمار کی ہین، کیا یہ درست ہے، حالانکہ بعض اشخاص کی عمر ۷۰، ۸۰ برس اور بعض کی ۲۰ بھی ہوتی ہے، کیا یہ قاعدہ کلیہ مناسب ہے اگر ہو تو کس بنا پر،

(۵) اکثر اشخاص یہ اعتراض کرتے رہتے ہین کہ اکبر بادشاہ نے جو ہندو راجپوت گھرانون سے شادیان کی تھین، وہ غیر شرعی طور پر حرام سرا مین داخل ہوئی تھین، اور اپنے مذہب پر قائم رہین، تو ان کے بطن سے جو اولاد ہوئی وہ شرعًا اور اخلاقًا ناجائز تھی،

(۶) (الف) تاریخ فرشتہ سے اکثر پہلے یا بعد ہندوستان کی تاریخین لکھی گئی ہین، جو ہر لحاظ سے تاریخ فرشتہ پر ترجیح رکھتی ہین، اور لکھنے والے ایسے دربارون سے وابستہ تھے جو تمام ہندوستان پر حکمران تھے، اس لحاظ سے ان مورخین کی تاریخین ہر لحاظ سے فرشتہ پر مقدم سمجھی جا سکتی ہین، لیکن بخلاف اس کے اکثر سرکاری و غیر سرکاری لائبریریون یا ذاتی کتب خانون مین فرشتہ ہی دیکھی گئی ہو، اور اکثر زمانۂ حال کے مورخین نے بکثرت اس کے حوالہ سے اپنی تالیفات مکمل کی ہین، اگر کسی نے خاندان مغلیہ پر بھی قلم اوٹھایا ہو، تو اوس نے اوس کے ہی اقتباسات نقل کئے ہین، حالانکہ مغلون کے درباری مورخین کے مستند تحریرات موجود ہین، اور اکثر واقعات عینی شاہد کی حیثیت سے لکھے گئے ہین، پھر معلوم نہین کہ ریاست دکن کے درباری مورخ کے بیانات کو کیون اتنی اہمیت دی گئی ہو، اس کی نسبت تاریخی حقائق کی روشنی مین ذرا وضاحت سے جواب دین کیا اس مین، دیگر تواریخ سے زیادہ تحقیق و تنقید سے کام لیا گیا ہو، یا اس قدر سہل ہے کہ ہر آدمی استفادہ کر سکتا ہے، میری ناقص راے مین

یہ بات بھی درست نہین ہے، پھر اس کے مقبول عام ہونے کی وجہ کیا ہے،

(ب) فرشتہ کے باپ کا نام کیا تھا، واقعی وہ قتل ہوا تھا، کیون اور کس جگہ؟

(۷) (الف) خاندان مغلیہ سے پہلے دربار مین حفظ مراتب کا قاعدہ تھا یا نہین؟

(ب) ہفت ہزاری، پنج ہزاری، سہ ہزاری، پنجصدی سے کیا مراد ہے، آیا یہ امرا اتنی سپاہ رکھنے کے مجاز تھے، یا اتنی تنخواہ ملا کرتی تھی، جو سپاہ ان کے ماتحت ہوا کرتی تھی، اسکی تنخواہ کون دیتا تھا،

(۸) ہند مین قبل از حکومت برطانیہ مالگذاری کی تشخیص کا کیا طریقہ تھا، اور وصولی کا کیا نظام تھا، معاملہ نقد ہوتا تھا یا جنس کی صورت مین، کیا انگریزی حکومت سے پہلے بھی زمین کی پیمائش ہوئی ہے، یا نہین،

(۹) شیر شاہ سوری کی نسبت عام شہرت ہے، کہ اوس نے بنگال سے لیکر پشاور تک پختہ سڑک بنوائی تھی، کیا یہ درست ہے، یا ویسے ہی گپ ہے، اگر درست ہو تو انگریزون سے پہلے تو اس سڑک کے آثار کبھی بھی کسی جگہ پائے نہین گئے،

مذکورۂ بالا سوالات کے جواب از راہ کرم عنایت فرما کر ممنون فرمائین، ذرہ نوازی ہو گی"

سلطان شہاب الدین کے قاتل، مقتل، مرقد،

معارف:۔ آپ کے مکتوب گرامی سے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ سلطان شہاب الدین غوری کے واقعۂ شہادت کے متعلق سات آٹھ سو برس گذرنے کے باوجود ایسی دیہی روایتین سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہین، جن سے یک گونہ مورخین کے بیانون کی تصدیق ہوتی ہے،

(الف) **قاتل** یہ واقعہ ہے کہ سلطان شہاب الدین کا واقعۂ قتل لاہور سے غزنی مراجعت کرتے ہوے دریاے جہلم کے کنارے پیش آیا، لیکن اس کے قاتلون کے متعلق ابتدا سے دو روایتین

نقل ہوتی آرہی ہین، ایک تو یہ کہ وہ قوم کھوکھر کے جو مغربی پنجاب کے پہاڑی علاقون مین آباد تھے، چند جانباز فدائی جوان تھے، انھون نے اپنی قوم کے مقتولون کا بدلہ لینے کے لئے اپنی جانین دیکر سلطان کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے باہم حلف اٹھایا تھا، اس لئے کہ سلطان شہاب الدین آخری بار مرتبہ ہندوستان مین خاص طور پر کھوکھرون کا استیصال کرنے کے لئے آیا تھا، جنھون نے اپنی لوٹ سے لاہور و غزنی کے درمیان کے راستہ کو اس قدر پرخطر بنا دیا تھا کہ سرکاری محاصل لاہور سے غزنی نہ بھیجے جا سکتے تھے، چنانچہ وہ ہندوستان آیا، قطب الدین ایبک کو بھی دلّی سے بلایا، اور کھوکھرون پر سخت حملے کرکے ان کی قوت کا خاتمہ کیا، اور انھون نے اطاعت قبول کی، انھین وہ زیر کرکے لاہور سے غزنی کے قصد سے روانہ ہوا۔ دریاے جہلم کے کنارے ایک منزل "دمیک" مین اترا، یہان سے ۳؍شعبان کو کوچ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی، کچھ خیمے اکھڑ چکے تھے، سلطانی خرگاہ ایستادہ تھا، کہ ۲؍ کا دن گذار کر ۳؍ کی شب کو عشاء کے وقت اچانک ایک چوبدار کو کسی اجنبی نے زخمی کیا، لوگ اسکی طرف دوڑ گئے، سلطانی خوابگاہ کی محافظ سپاہ بھی اس ناشدنی واقعہ کو دیکھکر اپنے فرض منصبی سے غافل ہوئی، اور اس زخمی چوبدار کو دیکھنے چلی آئی، اس طرح حملہ آورون کی حکمت عملی کامیاب ہوئی، وہ سلطانی خوابگاہ کا سراپردہ اٹھاکر اندر گھس گئے، سلطان عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے جانماز پر کھڑا تھا، حملہ آورون نے اطمینان سے چھریون سے بائیس زخم پہنچائے، اور سلطان کی روح پرواز کر گئی،

قاتلون کے متعلق دوسری روایت یہ ہے کہ اوس کو اسماعیلی ملاحدہ کے چند فدائیون نے شہید کیا تھا، اس لئے کہ سلطان اس سے پہلے مختلف مقامون پر ان کا قلع قمع کر چکا تھا، اور یہان سے واپس جاکر وہ ان کے مرکز پر حملہ آوری کا ارادہ رکھتا تھا،

سلطان کے قاتل کی حیثیت سے بس انھی دو جماعتون کے فدائیون کے نام لئے گئے ہین، سلطان سے قریب عہد کی فارسی تاریخون مین طبقات ناصری قاضی منہاج (۶۶۵ھ) اور تاریخ جہانکشاے

جوینی (۶۵۵ھ) مین سے اول الذکر مین اسماعیلی ملاحدہ کو اور موخر الذکر مین ہندو کھوکھرون کو قاتل بتایا گیا ہے، طبقات ناصری مین ہے:-

"و در آن وقت جماعت متمردان از کوکھران (در نسخہ ثانی کھوکھران) و قبائل کوہ جود (در نسخہ ثانی جون) عصیان آوردہ بودند و سلطان در آن زمستان بہندوستان آمد، و آن طائفہ متمردان را بدوزخ فرستاد و غزو بسنت بفرمود، و چون از آن جماعت برانداخت مراجعت بغزنین کرد، بدست فدائی ملاحدہ در منزل دمیک در شہور سنۃ اثنین وستمائۃ شہادت یافت" (ص ۱۲۳، ۱۲۴)

تاریخ جہانکشاے جوینی مین ہے:-

"چون عنان انصراف معطوف گردانید واز معبر جیلم (نسخہ جیلی) عبور کرد، و بر شط جیحون بارگاہ برآوردند، چنانک یک نیمہ از بارگاہ در آب بود، و در محافظت آن جانب از فدائیان احتیاط ترک گرفتہ ناگاہ ہندوے دو سہ میان روز بوقت قیلولہ سلطان چون آتش از آب برآمدند، و در بارگاہ افتادند و از ترقب ترصد حساد و مکاد غافل از غدر روزگار ذاہل روز سپید سیاہ او را بافتادہ، شاہ شب سیاہ نمودند و مذاق طعم حیاۃ را بر او تباہ کردند" (جلد ۲ ص ۵۹ طبع لیڈن)

ان کے بعد ہم دست فارسی تاریخون مین سب سے قدیم مستوفی قزوینی (۷۳۰ھ) کی تاریخ گزیدہ ہے، اس مین مذکور ہے:

"و در راہ فدائیان ہندوان کوکری در حالت نماز کردن، او را شہید کردند" (جلد ۱ ص ۴۱۲)

عرب مورخین مین سے ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ، سلطان شہاب الدین کا تقریباً ہمعصر ہے، اس نے

قتل کے واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، اور اصلاً کھوکھرون کو قاتل گردانا ہی، اور ضمناً اسماعیلیون کی طرف اس واقعہ کے منسوب ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہی، چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

وفی ھذہ السنة (۶۰۲ھ) اول	اسی سال (۶۰۲ھ) شعبان کی پہلی رات
لیلة من شعبان قتل شہاب الدین	کو شہاب الدین ابو المظفر محمد بن سام
ابو المظفر محمد بن سام الغوری ملک	غوری شاہ غزنی و بعض حصۂ خراسان
غزنة و بعض خراسان بعد عودہ	لاہور سے اپنی واپسی مین ایک منزل دمیک
من لھا وور عنزل یقال لہ دمیک	مین عشا کی نماز کے وقت قتل کیا گیا، اس
وقت صلاة العشاء و کان سبب	کے قتل کئے جانے کا سبب یہ تھا کہ کھوکھر
قتلہ ان نفراً من الکفار الکوکریہ	کفار مین سے چند نفر اس کو قتل کرنے کا
لزموا عسکرہ عازمین علی قتلہ ...	عزم کرکے اس کے لشکر کے ساتھ ہوگئے...
فاغتنم الکوکریہ غفلتھم عن الحفظ	پس پاسبانون کو پاسبانی کی خدمت سے
فدخلوا علی شہاب الدین	غافل پاکر کھوکھرون کو غنیمت موقع ملا، اور
....	وہ شہاب الدین کے پاس پہونچے مین ۴

اس کے بعد ان واقعات کی تفصیل ہی جن کو ہم اوپر اجمالاً نقل کرچکے ہین، اس کے بعد وہ قاتلون کی گرفتاری کا تذکرہ کرتا ہی کہ

فاخذوا اولئک الکفار فقتلوھم	پھر ان کفار کو پکڑ لیا، اور انھین قتل کردیا
وکان فیھم اثنان مختونان،	اور ان مین سے دو مختون تھے،

اس کے بعد لکھتا ہے :-

وقیل انما قتلہ الاسماعیلیہ لانھم	اور کہا گیا ہے کہ انھین اسماعیلیون نے

خافوا خروجہ الی خراسان وکان	قتل کیا، اس لئے کہ انھین اس کے خراسان
لہ عسکر یحاصر بعض قلاعھم علیٰ	پر حملہ آور ہونے کا خطرہ تھا، اور اس کا
ماذکرناہ،	لشکران کے بعض قلعون کا محاصرہ بھی کئے
(ج ۱۲ ص ۸۲ طبع مصر)	ہوئے تھا، جیسا کہ ہم لکھ چکے ہین،

اسی طرح ابن خلدون نے اولاً کھوکھرون کو قاتل قرار دیا ہے، پھر اسماعیلیون کے متعلق روایت درج کی ہے (جلد ۴ ص ۴۰۹)

اس کے بعد فارسی تاریخون مین بدایونی (۹۹۶ھ) وغیرہ کا دور آتا ہی ان کے یہان اسماعیلیون کے متعلق روایت موجود نہین، چنانچہ منتخب التواریخ مین ہے :-

"و ہنگام مراجعت در دمیک کہ نام دیہی است از توابع غزنین از دست فدائی کھوکھر شہید شد"

(ج ۱ ص ۵۲)

محمد قاسم فرشتہ نے بھی اپنی تاریخ (تکمیل ۱۰۱۵ھ) مین دراصل اپنے پیشرؤن کی تقلید کی ہے، لکھتا ہے :-

"بیست نفر از کفار گکھران کہ اکثر خویشان و اقربا، و فرزندان ایشان در جنگ سلطان شہاب الدین (اس جنگ کی وہی تفصیل جو اوپر گذری درج کرچکا ہے) کشتہ شدہ بودند، ہم عہد و ہم سوگند شدہ و کشتہ شدن برخود قرار دادہ، درباب کشتن سلطان شہاب الدین تدبیرہا جستند ....." (ص ۶۰)

مناسب ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ کے استفسار کے اس حصہ پر یہان نظر ڈال لیجائے جس مین آپ نے فرشتہ کی اس غلط فہمی یا غلط بیانی کا ذکر کیا ہی کہ اس نے سلطان کے قاتل کی حیثیت سے کھوکھرون کے بجائے "گکھرون" کا نام لیا ہی، تاکہ فرشتہ کے بیان سے سلطان کے قاتلون

مین ایک نئی جماعت کے نام کا اضافہ نہ ہو جائے، شاید آپ کو معلوم ہو کہ تاریخ فرشتہ کا مطبوعہ نسخہ بہت غلط چھپا ہے، یہ واقعہ ہے کہ اس مین "کھوکر" اور "گکھر" مین امتیاز نہ رہ سکا ہے، مختلف مقامون پر جہان گکھر ہونا چاہئے، "کہکر" چھپا ہے، مثلاً (ا ص ۲۴۴) مین "سلطان آدم" کو گکھر کے بجائے کہکر کہا گیا ہے، اسی طرح ۷۴۳ھ مین تملک چندر سردار کھوکھر کی بغاوت کا ذکر ہے، اس موقع پر بھی "کہکر" چھپ گیا ہے، (ص ۱۳۷)

اسی طرح جسرت کھوکھر کے لاہور کے صوبہ دار کو مارنے کا ذکر ہے، وہان بھی کہکر ہے، اس کے برخلاف بدایونی وغیرہ مین کھوکھر، اور گکھر کے فرق کا لحاظ ہر جگہ موجود ہے، اس مین جہان کھوکھر ہونا چاہئے، کھوکھر ہے، جیسے جسرت کھوکھر (جلد ۱ ص ۲۸۹) گل چندر کھوکھر (ج ۱ ص ۲۳۱) اور گکھرون کو "کہکر" لکھا گیا ہے، جیسے "سلطان آدم کہکر" (ج ۱ ص ۲۹۱) "برسر کہکران" (ج ۱ ص ۳۸۸) اوّل "بناء بہ کہکران" (ج ۱ ص ۳۰۶) وغیرہ، یہ سمجھنا کہ بدایونی ان دونون قومون مین امتیاز رکھ سکے، اور تاریخ فرشتہ جو چند سال بعد تکمیل کو پہنچی، اس مین ان دونون کو خلط ملط کر دیا جائے، یہ قیاس سے دور معلوم ہوتا ہے، اس لئے قیاس ہے کہ طباعت کے وقت کاتب کے قلم سے سہو ہوا، اور وہ "کھوکھر" اور "کھکر" مین امتیاز نہ رکھ سکا، اور اس ایک غلطی سے ایک قوم کا پورا بار گناہ دوسری قوم کے سر آگیا،

بہر حال سلطان کے قاتلون کے سلسلہ مین روایات کے اہم سرچشمے آپ کی خدمت مین پیش کر دیئے گئے، آپنے ملاحظہ فرمایا کہ متقدم مورخین مین سے ابن اثیر (۶۳۶ھ) جوینی (تصنیف ۶۵۵ھ ومتوفی ۶۸۱ھ) قاضی منہاج (تصنیف ۶۵۸ھ) اور قزوینی (۷۳۰ھ) کی روایتین ہین، ان مین سے ابن اثیر (۶۳۶ھ) اور قزوینی (۷۳۰ھ) نے بہ تصریح کھوکھرون کا نام لیا ہے، جوینی (۶۵۵ھ) نے بھی "ہندوؤن" کو بتایا ہے جس سے مراد کھوکھر ہی ہو سکتے ہین، صرف صاحب طبقات ناصری قاضی منہاج (۶۵۸ھ) اسماعیلیون کو قاتل قرار دیتے ہین، لیکن قاضی منہاج کی یہ منفرد

روایت متاخرین مین مقبول نہین ہوئی، چنانچہ ملا بدایونی (۹۹۹ھ) اور فرشتہ (۱۰۱۵ھ) وغیرہ نے صرف اوّل الذکر بیان کو درج کیا، پھر زمانہ حال کے مغربی مورخین الفنسٹن وغیرہ نے بھی کھوکھرون کے قاتل ہونے کی روایت کو قبول کیا ہے، (تاریخ الفنسٹن ترجمہ اردو ص ۹۹۰)

یہان ایک گمان یہ ہو سکتا ہے کہ قاضی منہاج کی طبقات ناصری ناصر الدین قباچہ کے دربار مین لکھی گئی، اور اسی کے نام معنون ہے، اس کی حکومت کی فبیاد مین ملتان و سندھ کی اسماعیلی حکومتون کے کھنڈرون پر قائم کی گئی تھین، ان مقامات سے ان قرامطہ کا خاتمہ سلطان غیاث الدین اور شہاب الدین نے کیا تھا، ناصر الدین قباچہ، شہاب الدین کا صوبہ دار تھا، سلطان کی شہادت کا واقعہ اچانک پیش آیا تھا، اور سیاسی حیثیت سے بعض فریقون نے اس سے فائدہ بھی اٹھانا چاہا تھا، اس لئے سندھ و ملتان مین اس واقعہ قتل کو اس زمانہ مین اسماعیلیون کی طرف سے مزید برگشتگی پیدا کرنے کے لئے ان کی طرف منسوب کیا گیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہین، اور وہی افواہین حقیقت بنکر قاضی منہاج کے کانون مین پہنچی ہون، اور انھون نے اپنی تاریخ مین اس کو جگہ دے دی ہو، آپکو یہ سُن کر تعجب ہوگا، کہ مفسدین نے سلطان کے شہید کئے جانے مین حصہ لینے کے الزام سے اس عہد کے فاضل روزگار صاحب کمال امام فخر الدین رازی کے دامن کو بھی محفوظ نہ رکھا اور یہ افواہ ایسی پھیلائی گئی، کہ امام موصوف کو اپنی جان بچانے کے لئے فرار ہونا پڑا، ابن اثیر لکھتا ہے:-

وجاء بعض المفسدین من اھل	اہل غزنی مین سے بعض فتنہ پرداز اٹھے
غزنۃ فقال للممالیک ان فخر الدین	اور انھون نے ممالیک سے کہا کہ فخر الدین
الرازی قتل مولاکم لانہ ھو وصل	رازی نے تمھارے آقا کو قتل کیا ہے، اس لئے
من قتلہ .... فثاروا بہ	کہ انھی نے ان کو پہنچایا، جنھون نے ان کو
لیقتلوہ فھرب وقصد مؤید الملک	قتل کیا، ...... پس وہ (ممالیک) ان (رازی)

الوزیر فاعلمه الحال فسیره سرًا الی مامنه، (جلد ۲ ص ۸۳)

کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے کہ ان کو قتل کرین، چنانچہ وہ فرار ہوے اور وزیر موید الملک کے پاس پہونچے، اسکو صورت حال سے باخبر کیا، اور اس نے ان کو پوشیدگی کے ساتھ ان کی پناہ گاہ مین بھیج دیا،

حالانکہ سلطان شہید کے تعلقات امام موصوف سے شگفتہ تھے، وہ اون کے علم وفضل کا قدردان تھا، ان کی مجلس وعظ مین ہر ہفتہ التزام سے شریک ہوتا تھا، ایک مرتبہ انھون نے سلطان کو اس کے دنیاوی جاہ وحشم پر برسر منبر نصیحت کے چند کلمات کہے، جن سے وہ متاثر ہو کر آبدیدہ ہو گیا تھا، بااین ہمہ ان کے مخالف انھین متہم کرنے سے باز نہ آئے، اور مشتعل مجمع کے خوف سے انھین روپوش ہونا پڑا (ابن اثیر ج ۲ ص ۸۳، منتخب التواریخ بدایونی ج ۱ ص ۵۳)

عجب کیا ہی کہ اس واقعۂ قتل کے اسماعیلیون کی طرف منسوب ہو جانے مین لفظ فدائی کو بھی دخل ہو، جیسا کہ اوپر گذرا، کھوکھرون مین سے چند جوانون نے سرفروشانہ اس قتل کی واردات کرنے کا عزم کیا تھا، اس لئے انھین معنوی طور پر "فدائی" کہا گیا، اور اس زمانہ مین اسماعیلیون کی وہ جماعت جو جان پر کھیل کر قتل کی واردات کرتی رہتی تھی، "فدائی" ہی کے نام سے موسوم تھی، اس لئے ممکن ہے، کہ اس وصف مشترک کے باعث ان قاتلون کی نامزدگی مین لوگون کا ذہن اسماعیلیون کی طرف منتقل ہو گیا ہو، کیونکہ مورخین نے بھی عام طور پر کھوکھرون کی اس قاتل جماعت کو "فدائی" کے لقب سے موسوم کیا ہی، بدایونی کہتا ہے، "از دست فدائی کھوکھر" پھر آگے چل کر امام رازی کے واقعہ کے سلسلہ مین لکھتا ہے، کہ "از روے حسد امام را بشرکت فدائیان متہم داشتہ" جس سے بدایونی کی مراد ظاہر ہے، کہ "فدائیان کھوکھر" ہی،

ان حالات سے اسکا اندازہ ہوسکتا ہی کہ واقعۂ قتل کی اصل ذمہ داری کھوکھرون ہی پر ہے اور روایۃً ودرایۃً یہ کسی طرح ممکن نہین کہ کھوکھرون کو اس واقعہ کے ارتکاب سے بری سمجھا جاسکے، لیکن ان تمام قیاسون کے باوجود جو اوپر پیش کئے گئے، یہ سمجھنا بھی صحیح نہ ہوگا، کہ اسماعیلی سرے سے اس جرم سے بری ثابت ہوتے ہین، بلاشبہہ وہ تنہا اس کے ذمہ دار قرار نہ پائین گے، اس موقع پر اس کی تائید مین ابن اثیر کے بیان کا وہ حصہ خاص طور پر ہماری رہنمائی کرتا ہی کہ قاتلون مین سے دو مختون بھی تھے، اس لئے یہ خیال زیادہ صحیح ہوسکتا ہے، کہ سندھ وملتان کے بعض اسماعیلی فدائیون نے کھوکھرون سے، جو سلطان کے تازہ حملہ سے اس کے دشمن ہوگئے تھے، ساز باز کی ہو اور سلطان کے شہید کرنے مین یہ دونون شریک ہون، اور قاتلون مین سے گرفتار ہونے والون مین وہ دونون مختون، اسماعیلی فدائی ہون، خصوصًا اس لئے کہ ملاحدہ ساز باز کرنے اور قتل وخونریزی کے خفیہ جرائم کرنے مین مشاق تھے، انھون نے اپنی تدبیرون سے کھوکھرون کے چند جانبازون کو سلطان کے قتل کرنے پر آمادہ کر لیا ہو، اور اس کو کامیابی سے انجام دینے کی جو حکمت عملی بتائی گئی ہو، وہ انہی کے ہاتھون تیار ہوئی ہو، اس لئے ہمارے خیال مین سلطان کے قاتل کی حیثیت ان دونون جماعتون کے جانبازون کا نام لیا جانا زیادہ قرین صحت ہے، بہرحال جو کچھ عرض کیا گیا، وہ انہی مذکورۂ بالا بیانون کی روشنی مین ہے، باقی اصل حقیقت کیا ہے، یہ اللہ تعالی ہی کے علم حقیقی مین ہے، والعلم عند اللہ،

(ب) **شہید کرنے کا سبب**، سلطان کے شہید کرنے کی وجہ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے، یہی ہے کہ چونکہ سلطان نے کھوکھرون کا استیصال کیا تھا، اس لئے ان مین کے چند نوجوانون نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا، دوسری طرف وہ اسماعیلیون پر پے در پے حملے کر چکا تھا، اور آئندہ بھی حملہ آوری کا قصد رکھتا تھا، اس لئے اسماعیلی فدائی بھی اس کے خون کے پیاسے تھے، اس لئے

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اسکی روشنی مین بھی کہا جا سکتا ہو، کہ انہی اسباب سے ان دونون جماعتون کے فدائیون نے اس قتل مین حصہ لیا،

(ج) **مرقد**، سلطان کے مرقد کے متعلق اس مقام "دھمک" کے دیہی لوگون نے جس قبر کا نشان بتایا ہے، وہ قطعی بے اصل ہے، اس لئے ڈپٹی کمشنر جہلم کے ذریعہ سے اس فرضی قبر کو آثار قدیمہ مین داخل کرانے کی سعی کرنا صحیح نہ ہوگا، کیونکہ تمام مورخین کا بیان بلا اختلاف یہی ہو کہ سلطان کی لاش غزنی لیجائی گئی، ان تاریخون مین جن کے حوالے اوپر گذرے ہین، اسکی لاش کے مقتل سے غزنی تک پہونچنے کی مفصل روداد مع مختلف تصریحات کے آپ ملاحظہ فرمائین، اگر یہ تصریحی روایتین موجود نہ بھی ہوتین تو بھی یہ عقل و درایت سے دور ہے، کہ لوگ اپنے عہد کے ایک ایسے جلیل القدر فرمانروا کو اثنائے راہ مین دفن کر کے آگے بڑھ جائین، اس لئے وہ تربت جو دھمک مین سلطان شہاب الدین کی بتائی جاتی ہے، قطعی جعلی ہے،

(د) **مقتولون کی تعداد**، جیسا کہ اوپر گذرا، حملہ آورون نے پہلے ایک چوبدار کو مار ڈالا، پھر سلطان کو شہید کیا، یہ کوئی فوجی چھاپہ نہ تھا، بلکہ فریب سے سلطان کو شہید کرنے کی ایک سازش تھی جو کامیاب ہو گئی،

(ھ) **مقتل**، سلطان شہاب الدین کا مقتل تمام مورخین کی تصریح کے مطابق لاہور و غزنین کے درمیان دریا کے کنارے واقع ہو، اس مقام کا نام فارسی و عربی تاریخون مین "دمیک" آیا ہو، چنانچہ ایک قطعہ مین ہے :-

شہادت ملک بحر و بحر شہاب الدین (بدایونی) / معز الدین (ناصری)	کز ابتدائے جہان ہم (بدایونی) / شہ (ناصری) نیامد یک
سوم زغرۂ شعبان بسال شش صد و دو	فتادہ در رہ غزنین بمنزل "دمیک"

فرشتہ مین اس مقام کا نام "برہمیک" چھپا ہو، اس کے نسخہ مین طباعت کی غلطیان معلوم ہین،

لیکن جس دریا کے کنارے سے یہ واقعہ پیش آیا، اس کے نام مورخین نے مختلف لکھے ہین، فرشتہ مین اس کا نام "نیلاب" ہو، (ص ۶۰) یہ اس زمانہ مین دریائے سندھ کا معروف نام تھا، (فرشتہ ص ۲۲۸) اس لئے اس کے بیان کے مطابق دمیک "دریائے سندھ" کے کنارے واقع تھا، ابن اثیر اور دوسری تاریخون مین دریا کا نام "جیحون" مندرج ہے، لیکن جیحون، لاہور اور سندھ کے درمیان واقع نہ تھا، وہ افغانستان کی موجودہ شمالی سرحد کے اس پار روان ہے، اس لئے گمان ہے کہ جیحون "جہلم" کے بجائے درج ہو گیا ہو، اس زمانہ مین اس کو آب جہلم داب بہت کہتے تھے، ابن اثیر کے لئے یہ نام غیر معروف تھا، اس نے جہلم کے بجائے جیحون لکھ دیا ہو، مغربی مورخین نے بھی اس کو جہلم ہی قرار دیا ہو، چنانچہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی تاریخ ہند حصہ اول مین جو فارسی تاریخون اور مغربی مصنفین کی کتابون سے مرتب کی گئی ہے، لکھتے ہین :-

"اس مہم کے بعد سلطان واپس جا رہا تھا اور جہلم کو عبور کر چکا تھا، کہ ...... (جلد ۲ ص ۱۳۲)

اس سے یہ غیر مشتبہ طور پر معلوم ہو جاتا ہو، کہ دمیک دریائے جہلم کے کنارے آباد تھا جہان یہ واقعۂ شہادت پیش آیا، ضلع جہلم کے گاؤن "دھمک" کے جو جغرافی حالات آپ نے لکھے ہین، ان مین یہ تصریح نہین کہ یہ مقام دریا کے کنارے آباد ہو، اگر وہ لب دریا واقع ہے، تو تاریخی شہادتون سے اس روایت کی جو سینہ بہ سینہ آرہی ہو، تصدیق ہوتی ہے، "دھمک" کا فارسی و عربی مین "دمیک" ہو جانا، یا "دمیک" کا سات آٹھ سو برس گذرتے گذرتے "دھمک" بن جانا کچھ بعید از قیاس نہین، آپ کے نواب صاحب شکریہ کے مستحق ہین، کہ انھون نے سلطان شہاب الدین کے مقتل کی صحیح نشاندہی کی، اگر دھمک مین وہ فرضی تربت لب دریا واقع ہو، تو اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا جا سکتا ہو، کہ شاید وہی مقام ہو، جہان اس منزل مین سلطانی قافلہ اترا ہو، اور اسی جگہ یہ واقعۂ قتل پیش آیا ہو، اور لوگون نے یادگار کے لئے کوئی نشانی قائم کی ہو، جو اب تربت کی شکل مین منتقل ہو گئی ہو،

(۲) قوم گکھر

اکبر نامہ مین مختلف زمانوں مین قوم گکھر کی سرکشی کرنے اور اطاعت قبول کرنے کے واقعات مختلف مقامون مین مندرج ہین، ایک مقام پر اس نے اس قوم کے ہندوستان مین آنے کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

"پوشیدہ نماند کہ گکھران را طوائف بسیار است، و در مابین آب بہت (دریائے جہلم) و سند توطن دارند، در زمان سلطان زین الدین کشمیری ملک کد نام از امرائے غزنین کہ بحاکم کابل نسبتے داشت آمدہ بزور این جا را از تصرف کشمیریان گرفت و بعد از و ملک کلان پسر او جانشین پدر شد، و بعد از و پسر او بیر نام کلائی اسوس خود یافت و بعد از و تتار ناظم قبیلۂ خود شد، و او را با شیر خان افغان و سلیم خان پسرش منازعت عظیم روے داد، و خود را از منتسبان این دودمان میدانست، چہ در زمانے کہ حضرت گیتی ستان فردوس مکانی تسخیر ہندوستان فرمودہ بودند، در ملازمت حضرت آمدہ خدمات شایستہ بتقدیم رسانیدہ بود، علی الخصوص در جنگ رانا سانکا جانفشانی نمودہ، و او را دو پسر بود، سلطان سارنگ و سلطان آدم، و بعد از سارنگ کلانی آن گروہ بسلطان آدم رسید، و پسران سارنگ کمال خان و سعید خان گکھر متابعت بنفاق می کردند"،

(ج ۳ ص ۳۲۳، ۳۲۴ طبع کلکتہ ۱۸۸۶ء)

مزید حالات کے لئے مسٹر تالبٹ نے جہلم کے گزیٹر مین جو کچھ لکھا ہے، براہ کرم اس کو نقل کر کے روانہ فرمائین تاکہ اس کو سامنے رکھکر اگر ضرورت ہو تو اس موضوع پر مزید گفتگو کیجائے،

(۳) ترک، تاتاری، مغل اور کیانی

(الف) قدیم تاریخ کے بیان کے مطابق بحر خزر کوہ آرال، التائی، خطائی اور ہمالیہ کے درمیان

جو وسیع خطۂ ارض ہے، اور جس کے ایک حصہ کو آج بھی ترکستان کہا جاتا ہے، اس مین وہ تمام ممالک داخل ہین جہان تاتاری قوم آباد تھی، ترک، تاتاری اور مغل اسی خطۂ ارض سے اٹھے اور مختلف زمانون مین دنیا کے مختلف گوشون مین پہونچے، اور مختلف نامون سے یاد کئے گئے، مغربی مورخین اس نتیجہ تک پہونچے ہین کہ یہ سب قومین واحد الاصل ہین، اور انھین ابتداءً ترک کہا جاتا تھا، (تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۲) باقی رہے کیانی، تو یہ ان سے مختلف الاصل ہین، ان کا تعلق ایران سے ہے، یہ ابتداءً دریائے سیحون و جیحون کے سواحل پر آباد تھے، اقوام ترک نے انھیں یہان سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا، ایران مین آئے اور اسی سرزمین پر حکمرانی کی، (تاریخ منطقی جدید ایران ص ۱۲، ۱۹)

(ب) قومون کی تقسیم عزت و ذلت کیلئے نہین، بلکہ تعارف اور پہچان کے لئے ہے، جعلناکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم یہ ہماری نظر رہنی چاہئے،

(۴) فیصدی تین پشتین

آپ کا ارشاد صحیح ہے، کہ بعض مورخین نے فیصدی تین پشتین شمار کی ہین، اس موضوع پر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ مین بحث کی ہے، وہ کہتا ہے کہ اس زمانہ مین لوگون کی عمرین ۶۰۔۷۰ کے درمیان ہوتی ہین، اور انسان کے انتہائی نمو کا زمانہ ۴۰ سال ہوتا ہے، قرآن مجید مین ہے حتی اذا بلغ اشدہ و بلغ اربعین سنۃ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک پشت کے لئے ۴۰ سال اوسطاً چاہئین اور اسی لئے بنو اسرائیل وادی تیہ مین ۴۰ سال سرگردان رکھے گئے، تاکہ ان کی ایک نسل ختم ہو کر نئی نسل عہد شباب مین آجائے، اس طرح تین پشتون کے لئے ۱۲۰ سال چاہئین، اور انہی کا اوسط ۱۰۰ مان لیا گیا ہے، کہ سو سال مین بہر صورت کم و بیش تین پشتین گذر جائین گی، یہ اصول ایسے موقعون کے لئے ہے، جن مین لوگون کی عمرین بہ تعیین معلوم نہین ہون، لیکن جہان بہ تعیین معلوم ہون، وہان اس اصول کے اختیار کرنے کی ضرورت پیش نہ آئیگی، یہ محض قیاسی

تخمینی اصول وضع کیا گیا ہی، جو عام حالات مین صحیح نکلتا ہے، اس لئے ابن خلدون نے بھی آخر مین کہدیا ہے:

فتامله تجده فی الغالب صحیحًا ۔۔۔ اس پر غور کرو اس کو بالعموم صحیح پاؤ گے

(مقدمہ ص ۱۸۹)

(۵) غیر مومنہ کے بطن سے مسلم کی اولاد دین

اگر کسی غیر کتابیہ مشرکہ کے بطن سے کسی مسلمان کی اولاد ہو تو شریعتِ اسلام کے رو سے اس کا وہی حکم ہوگا، جو آپ فرماتے ہین، لیکن کسی متعین شخص کے متعلق جبتک یہ بہ تعیین معلوم نہ ہو جائے کہ جس عورت سے اس نے شادی کی وہ اپنے آبائی دین بت پرستی پر قائم رہی، اور دین اسلام قبول نہین کیا، اس وقت تک کسی خاص شخص پر بتعیین طور پر کوئی حکم نہین لگایا جاسکتا، اس لئے جو لوگ اعتراض کرتے ہین ان سے اس کا ثبوت طلب کرین کہ مستند طور پر وہ دکھائین، کہ فلان شخص کی شادی شدہ عورت نے دین اسلام قبول نہین کیا تھا، اور اپنے آبائی دین پر قائم رہی تھی، لیکن اگر شادی کے وقت شرعی ایجاب و قبول کے ساتھ جو زوج کی طرف سے ادا کئے گئے، لڑکی کے باپ نے بت پرستانہ مراسم بھی انجام دلائے، تو وہ اس لڑکی کے باپ کا فعل تھا، خود اس لڑکی کے متعلق بہ تعیین معلوم ہونا چاہئے، کہ وہ زوج کے گھر آنے کے بعد بھی کلمہ گو نہین ہوئی، اور بت پرستی کرتی رہی،

(۶) تاریخ فرشتہ کیون زیادہ مقبول ہوئی اور فرشتہ کے بعض حالات

(الف) ہندوستان مین تاریخ فرشتہ ابتداءً اس لئے زیادہ مقبول ہوئی، کہ خوش قسمتی سے قلمی تاریخون مین سے وہ پہلے چھپ گئی، اور اصحاب ذوق کے ہاتھون مین وہ آسانی سے پہونچ گئی، علاوہ ازین یہ اپنے عہد تک کے ہندوستان کی جامع تاریخ تھی، اس مین ہندوستان کے قدیم عہد سے اپنے زمانہ تصنیف تک کے مختلف حکمران خاندانون کے حالات علحدہ بابون، اور فصلون مین مرتب

کئے گئے ہین، ابتداءً فارسی کی کوئی ایسی تاریخ مطبوع نہین ہوئی تھی، اس طرح کی دوسری کتابین غیر مطبوعہ تھین، پھر جب یورپ کے مطبعون اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ کتابین چھپنے لگین، تو وہ کسی نہ کسی خاص عہد سے متعلق تھین، اس لئے ہندوستان کی عمومی تاریخ کے لئے فرشتہ کی احتیاج عمومًا باقی رہی، اب جب کہ تقریبًا ہر دور کی کچھ نہ کچھ کتابین چھپ چکی ہین، اب آپ دیکھتے ہین کہ اہلِ علم کو فرشتہ کی احتیاج پہلے کی ایسی باقی نہین رہی، اور نہ اب آپ کو اس کے حوالے شاید زیادہ ملتے ہون،

(ب) محمد قاسم ہندو معروف بہ فرشتہ تقریبًا ۱۵۵۰ء مین پیدا ہوا، اس کے باپ کا نام غلام علی ہندو شاہ تھا، وہ صغر سنی مین استرآباد سے اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان چلا آیا تھا، وہ مذہبًا شیعہ تھا، شیعی نقطۂ نظر اس کی کتاب مین بھی کہین کہین نمایان ہی (تاریخ ایلیٹ جلد ۶ ص ۲۰۷)

اس کے قتل کئے جانے کی روایت آپنے کہان دیکھی؟

(۷) خاندانِ مغلیہ سے پہلے دربار مین حفظِ مراتب

اور

عہد مغلیہ کے مناصب ہفت ہزاری وغیرہ

(الف) شاہانِ مغلیہ سے بھی شاہی حقوق اور دربار مین حفظ مراتب کے آئین و دستور اور خطاب و مناصب موجود تھے، تفصیل کے لئے تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف وغیرہ فیروز شاہ وغیرہ کی تخت نشینی وغیرہ کے حالات ملاحظہ فرمائین، نیز ابن بطوطہ کا سفرنامہ دیکھین،

(ب) اکبر نے ایک خاص نظام کے ماتحت یہ مناصب قائم کئے تھے، جو اس کے جانشینون کے عہد مین بھی بہ تغیر یا بلا تغیر قائم رہے، اس نظام کا مدعا فوج مین اصلاح و ترتیب پیدا کرنا تھا، تعداد سے ان کی ارتقائی ترتیب کو ظاہر کرنا تھا، چنانچہ پنجہزاری سے اوپر کے مناصب صرف شاہزادون کیلئے

مخصوص کر دیئے گئے تھے، باقی مناصب کو تین درجون مین تقسیم کیا گیا، اصول یہ رکھا کہ منصب کو اعداد محض یا اعداد نسبی سے، اور اس کے درجہ کو سوارون کے شمار سے ظاہر کیا جائے، اگر سوارون کا شمار اعداد منصب کے برابر ہے، تو وہ منصب درجۂ اوّل مین شمار کیا جاتا تھا، اگر سوارون کی تعداد اعدادِ منصب کا نصف یا اس سے زیادہ ہو، تو درجہ دوم، ورنہ درجہ سوم سمجھا جائے گا، مثلاً پنجہزاری، پنجہزار سوار، پنج ہزاری، چار ہزار سوار، پنج ہزاری، دو ہزار سوار، ان مین پنجہزاری ہر جگہ منصب ہے، اور پانچ، چار اور دو ہزار سوار کی قید منصب کے اوّل، دوم اور سوم درجون کو ظاہر کرتی ہے، اگر کوئی اپنے منصب کی فوج خود بہم پہنچاتا، تو وہ واقعی منصب دار ہوتا تھا، اگر وہ کسی منصب دار کی فوج کے کسی حصہ کی سرداری پر مامور ہوتا تھا، تو وہ داخلی منصب دار کہا جاتا تھا، اس کے ساتھ ہر منصب اور اس کے ہر درجہ کے داخلیون کی تنخواہ کا ضابطہ مقرر تھا، اور "تنخواہ ذات" سے موسوم تھا، اور ہر ایک کی تنخواہ مع دواب شاہی کے مصارف کے حکومت سے اسکو ملتی تھی،

آئین اکبری مین ہے :-

"ازین رو گیہان خدیو، منصب پایہا ازدہ باشی تا دہ ہزاری قرار فرمود و افزون از پنجہزاری خاص فرزندان سعادت سرشت گردانید...... وگاہے منصب افزودہ سوار کمتر ہمراہ سازد و از کار آگہی ہر یکے را اندازۂ ستور برگرفت، و درخور سوار، در ماہوارہ دگرگونگی رفت، ہر کرا سوار موافق منصب باشد، اوین پایہ داد و نیمہ وزیادہ را دوم و کمتر ازان را سوم برساخت،

...... و یوزباشی یازدہ گونہ شد، نخست آنکہ با او صد سوار بود ماہوارہ ہفت صد روپیہ، و یازدہم آنکہ با او سوارے نبود، چنانچہ بیشتر در داخلیان اعتبار شود پانصد روپیہ، و نہ میانی را در ہر دو سوار بست روپیہ افزودہ گردد (ج ۱ ص ۱۲۳، ۱۲۴)

منصب دار اپنی تنخواہون کے اعتبار سے بھی دو قسم کے تھے، بعض بڑے تعلقے کے منتظم ہوتے تھے،

اور اپنا اور اپنی فوج کا گذارہ اسی سے وصول کرتے تھے، اور بعضون کو نقد تنخواہین ان کے منصب، فوج اور جانورون کی تعداد کے لحاظ سے دیجاتی تھیں،

اس موضوع پر آپ کو آئین اکبری مین مختلف آئین کے تحت مفصل معلومات ملین گے، اردو مین شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب (دہلی یونیورسٹی) نے ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور کے اجلاس ۱۹۳۳ء مین "مناصب اکبری اور ان کی تنخواہین" کے عنوان سے مضمون پڑھا تھا، جو اس کی روداد مین چھپ چکا ہے، (ص ۲۶۲-۲۷۶) آپ اسکو ملاحظہ فرمالین،

(۸) ہندوستان کے عہدِ اسلامی مین مالگذاری کی تشخیص اور اسکی تحصیل کا انتظام

ہندوستان کے عہد اسلامی مین مالگذاری کی تشخیص زمین کی پیداوار کی صلاحیت کی جانچ پڑتال کے بعد کیجاتی تھی، ابتداءً حکومت کے عمال کاشتکارون سے مالگذاری وصول کرتے تھے، مالگذاری بالعموم سکون کی شکل مین وصول کیجاتی تھی، سکون کے لئے اکبری عہد مین عمال کو ہدایت کی گئی تھی، کہ وہ کاشتکارون کو خالص و کامل وزنی سکون کے ادا کرنے پر مجبور نہ کرین، بلکہ جس قسم کا روپیہ وہ دین، محصل جمع کرنے والے اس کو لیکر رسید دے دیا کرین (آئینِ اکبری ج ۱ ص ، آئین جزیہ آبادی) جب صوبہ کے خزانچی کے پاس دو لاکھ درہم جمع ہو جاتے تھے، تو وہ رقم مرکزی حکومت کو بھیج دیجاتی تھی، صوبہ مین اس سے زیادہ جمع رکھنے کی اجازت نہ تھی (ر ص ۸

عہدِ اسلامی مین زمین کی پیمایش کا اہتمام رہتا تھا، عمل گذار کو ہدایت تھی، کہ وہ ہر مزروعہ زمین کی پیمایش کرے اور غور و خوض سے دیکھکر ان قطعات اراضی کی نوعیت و حقیقت سے آگاہی حاصل کرے (ر جلد ۱ ص ۱۹۸، آئین عمل گذار) اور لگان کی تشخیص کرے،

بعض خاص زمینون کی مالگذاری غلہ کی صورت مین بھی وصول کیجاتی تھی، کنکوٹ، دانہ بندی

بٹائی کے طریقے رائج تھے، لیکن اگر کاشتکار پورا غلہ لینا چاہتا تو غلہ کی قیمت بازار کے نرخ سے لگاتے اور نقد رقم وصول کرتے تھے، (آئین اکبری ج ۱ ص ۱۹۹)

ہر موضع کے لئے علٰحدہ علٰحدہ دفتر اور ان کے عہدہ دار تھے، جو معلومات کی مفصل روداد رکھتے تھے، (ص ۱۹۹) اور ایک فصل مین اگر بقایا رہ جاتا، تو اس کا اندراج دفتر مین کر لیتے، اور اس پر گاؤن کے سربرآوردہ لوگون کے دستخط لے لیتے، اور دوسری فصل کے موقع پر بقایا بھی وصول کرتے تھے، (ص ۲۰۰، ۲۰۱) اکبر نے پورے ہندوستان کی زمین کی پیمایش کر کے ان کو مختلف صوبون مین تقسیم کیا تھا، اور ہر مقام کی اراضی کے لحاظ سے مالگذاری کی تشخیص کرائی تھی، اور پہلی مرتبہ یہ دہ سالہ بندوبست قرار پایا تھا، لیکن عملاً یہی بندوبست تقریباً ۳۰ سال تک قائم رہا، زمین اپنی مختلف حیثیتون سے خالصہ، جاگیری اور معافی مین تقسیم تھی، اور اسی الحاظ سے ان سے مالگذاریان وصول ہوتی تھین (بنگال کی ابتدائی تاریخ مالگذاری، باب مغلون کا بندوبست ایسکولی ترجمہ اردو ص ۱۷)

(۹) شیر شاہی سڑک

شیر شاہی سڑک دراصل شیر شاہ ہی کی بنوائی ہوئی ہے، وہ آج کل "گرینڈ ٹرنک روڈ" کہی جاتی ہے، جو کلکتہ سے گیا، الہ آباد ہوتی ہوئی دہلی اور پھر اس کے آگے چلی گئی ہے، شیر شاہ نے یہ سڑک خلیج بنگالہ سے دریائے سندھ تک بنوائی تھی، اس سڑک پر جو سرائین، کنوئین وغیرہ تعمیر کئے گئے تھے، ان کے نشانات آج تک موجود ہین، نیز سڑکون پر شاہی زمانہ کے پل بھی کہین کہین موجود ہین، فرشتہ اور بدایونی وغیرہ نے اس سڑک کا تذکرہ کیا ہے، فرشتہ لکھتا ہے :-

"و آثار پسندیدہ و بسیار گذاشت، چنانچہ از بنگالہ و سنارگاؤن تا آب سند کہ آب نیلاب اشتہار دارد یک ہزار و پانصد کروہ است و در ہر یک کروہ سرائے ساختہ چاہ و مسجد از خشت پختہ

و بچہ پرداختہ موذن و مقری و امامے مقرر نمود، آنہارا وظیفہ متعین کرد، و در ہر یک دروازہ طعام پختہ و خام برائے مسلمانان، و دروازہ دیگر کذلک برائے ہندوان مقرر نمود، ......

و درین راہ از ہر دو جانب خیابان از درختان میوہ از قسم کھرنی و جامن وغیرہ نہال نشانیدہ بود، (ج ۱ ص ۲۲۸)

بدایونی لکھتا ہے :-

"و درین سال حکم عام کرد کہ از ولایت بنگالہ راست تا رہتاس غربی کہ چہار ماہہ راہ است و از آگرہ تا مانڈو در ہر کروہے سرائے و مسجدے و چاہے، از خشت پختہ آباد ان ساختہ و موذنے و امامے و مسلمانے و ہندوے برائے تہیہ سقایہائے آب نامزد کردہ لنگر طعامے برائے غربا و فقرا رہگذارے مہیا می داشتند، و دو رویہ راہ درختان بلند سر کشیدہ خیابانہا بہم رسید تا ہمہ مسافران در سایہ آن میرفتہ باشند و اثر آن تا اکنون کہ پنجاہ و دو سال از آن زمان گذشتہ در اکثر جاہا باقیست (منتخب اللباب جلد ۱ ص ۳۶۳)

اس سڑک کے علاوہ شیر شاہ نے بعض اور سڑکین بنوائی تھین، جن کا تذکرہ انہی ماخذون مین آیا ہے، اس شیر شاہی سڑک پر جو بنگال سے پشاور کو جاتی ہے، شاہی عہد کی عمارتون کے آثار اور اس زمانہ کے پل آپ آج بھی ملاحظہ فرما سکتے ہین، "س"

استفتا از حضرات علماے کرام

"مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب ریٹائرڈ کلکٹر نے جو ایک دردمند مسلمان ہین، اور جنھین مسلمانون کی صلاح و فلاح کے مسائل سے دلچسپی ہی، موجودہ زمانہ کے حالات کے پیش نظر مسلمانون کو امیر کے اصول انتخاب کے بارہ مین علماے کرام سے استفتاء کیا ہے، جسے شائع کیا جاتا ہے، جو علماے کرام اور ارباب فکر اصحاب مذہبی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر فرمائین گے، ان کو خوشی کیساتھ معارف مین شائع کیا جائے گا، "م"

یہ بات تو بالکل ظاہر ہی کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ مین مسلمانون کے امیر کا انتخاب غیر معین مدت کے لئے ہوتا تھا، اور نیز یہ کہ امیر خود مختار ہوتا تھا، اس کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہین ہوتی تھی، مگر اس کے باوجود زید کا خیال یہ ہے کہ ہم شرعًا اس امر پر مجبور نہین ہین، کہ ہم بھی اسی طرح اب عمل کرین، بلکہ ہم کو اختیار ہے کہ زمانہ کی ضروریات اور مقتضیات کے مطابق ہم نظامِ حکومت قائم کرسکین، مثلاً موجودہ زمانہ مین ہم ایسا نظامِ حکومت تجویز کرین کہ جس مین مجلسِ شوریٰ امیر کی منتخب کردہ نہ ہو، بلکہ وہ جمہور مسلمین کی منتخب کردہ ہو، اور مسلمانون کی اس منتخب کردہ مجلس شوریٰ کو امیر کے عزل و نصب کا کامل اختیار ہو، اور امیر کا انتخاب غیر معین مدت کیلئے نہ ہو، بلکہ ایک محدود زمانہ کے لئے اوس کو منتخب کیا جائے، خواہ اس کے بعد بار بار وہی منتخب کیا جائے، نیز یہ کہ امیر مختارِ مطلق نہ ہو، بلکہ اوس کے اختیارات پر مناسب اور ضروری پابندیان عائد ہون،

مذکورۂ بالا بیان پر زید کی دلیل یہ ہی کہ وصال نبی علیہ السلام کے بعد مسلمانون کو جب نظامِ حکومت

کے قیام کی ضرورت پڑی، اور خلافتِ راشدہ کا جو طریقہ معمول بہا رہا، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہی، کہ اس پورے زمانے اور اس پورے نظام مین یہ دو باتین تو اپنی جگہ بطور اصل کے قائم رہین،

اوّل یہ کہ نبوت اور خلافت مین وراثت جاری ہونا شرعًا صحیح اور جائز نہین ہی،

دوسرے یہ کہ اُن کے باہمی امور کا فیصلہ کتاب، سنت اور آپس کے مشورے سے ہوا کرے،

لیکن ان دونون باتون کے علاوہ باقی نظامِ حکومت کے تجویز کرنے نیز یہ کہ مذکورۂ بالا دونون باتون کو جامۂ عمل پہنانے کی صورتون اور طریقون مین ہم آزاد چھوڑ دئیے گئے ہین، اور اس بارہ مین ہماری رائے کی آزادی کو سلب نہین کیا گیا ہے، بلکہ جس زمانہ مین جیسے حالات ہون، اس کے مطابق ہم نظامِ حکومت کا نقشہ تجویز کرسکتے ہین، اور مذکورہ بالا دونون اصول پر حالات کی مہیا کردہ سہولت کے مطابق عمل کرسکتے ہین، چنانچہ خود خلافتِ راشدہ کی پوری مدت مین بھی کسی ایک ہی طریقے سے ہمیشہ امیر کا انتخاب نہین ہوا، بلکہ حسب اقتضاے زمانہ اوس کی مختلف صورتین رہین، پس چونکہ انتخاب کا کوئی خاص طریقہ کتاب و سنت مین منصوص اور مصرح نہین ہے، اس لئے ہم بھی اس بارہ مین صرف انہی طریقون کے اختیار کرنے پر مجبور نہین ہین، جو حضرات خلفاے راشدین کے زمانہ مین عمل مین لائے گئے، بلکہ وہ حضرات جس طرح اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے مختلف طریقے عمل مین لاتے رہے، اسی طرح ہم بھی اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق امیر کے انتخاب اور نظامِ حکومت کا نقشہ تجویز کرنے مین آزاد ہین، اور مختلف طریقے عمل مین لاسکتے ہین، اور شرعًا اس مین کوئی ہرج اور مضائقہ نہین ہی، علیٰ ھذا امیر کے اختیارات پر ضرورت اور وقت کے مناسب پابندیان عائد کردینے مین بھی شرعًا کوئی معذوری نہین ہی، اگرچہ خلافتِ راشدہ مین امیر کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہین ہوتی تھی، اور وہ کامل طور پر خود مختار ہوتے تھے، مگر ان جیسے حضرات صلحا اور اتقیا اس دنیا سے چلے گئے، اور ان کے بعد اس منصبِ جلیل پر نااہل لوگ قابض ہوتے چلے گئے، تو تجربہ نے قطعی طور پر یہ بتلا دیا، کہ امیر کا غیر معین

مدت کے لئے منتخب ہونا، اور اس کے اختیار پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کرنا بڑے بڑے مفاسد اور مضرتون کا سرچشمہ ہی، جیسا کہ بنو عباس اور بنو امیہ کی تاریخ اس قسم کے مفاسد اور مضرتون سے بھری پڑی ہے، زید مذکور کے خیال مین خلافتِ راشدہ کے اس قدر جلد ختم ہو جانے اور خلافت کے ملوکیت مین منتقل ہو جانے کے یہی دو امر خاص سبب ہیں، اس لئے اوس کے نزدیک قابلِ غور بات یہ ہے، کہ کتاب و سنت میں کوئی ایسی تصریح ہے بھی یا نہین، جو ان دونون باتون کو ہمیشہ کے لئے ہم پر ضروری اور واجب العمل ہونا ثابت کرتی ہو، اور اس کے خلاف صورت جائز ہی نہ ہو، سو ظاہر ہی، کہ کتاب و سنت سے ایسی کوئی تصریح پیش نہین کیجا سکتی، بلکہ جو کچھ کہا جاتا ہی وہ تمامتر خلفاے راشدین کے طرزِ عمل کی بنا پر کہا جاتا ہے، حالانکہ ان کا طرزِ عمل خود کسی ایک طریقہ پر نہ تھا، جو بین طور پر اسکی دلیل ہی کہ کسی خاص طرز اور مخصوص طریقہ کا ہم کو پابند نہین کیا گیا، بلکہ حسبِ ضرورت ہم نظام حکومت کے نقشہ میں تبدیلی کر سکتے ہین،

الحاصل مندرجۂ بالا تقریر سے زید مندرجۂ ذیل باتین ثابت کرتا ہی:

(۱) اسلامی نظامِ سیاست مین وراثت جائز نہین،

(۲) مسلمانون کے تمام امور کا فیصلہ کتاب و سنت و باہمی مشورہ سے ہونا چاہیئے،

(۳) مگر نمبر ۲ پر عمل کرنے کے طریقون اور نظامِ حکومت کا نقشہ بنانے مین خلافتِ راشدہ کا طرزِ عمل ہمارے لئے واجب التعمیل نہین ہے، بلکہ اونھی کے طرزِ عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ جس طرح انھون نے اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مختلف طریقون سے امیر کا انتخاب کیا، اور نظامِ حکومت بنایا، اسی طرح ہم بھی اپنے زمانے کے مطابق نظامِ حکومت کا نقشہ بنا سکتے ہین، بشرطیکہ امور نمبر ۱ و نمبر ۲ کا پورا پورا لحاظ اس نظامِ حکومت کے نقشے مین رکھا جائے،

(۴) ہمین اختیار ہی کہ امیر کا انتخاب ہم غیر معین مدت کے لئے کرین، یا حسبِ ضرورت کسی معین

مدت کے لئے،

(۵) ہمین اس کا بھی اختیار ہے، اگر ہم ضرورت محسوس کرین، تو اپنے امیر کے اختیارات پر مناسب پابندیان عائد کر دین،

(۶) ہم اس کے بھی مجاز ہین کہ اپنے امیر کے لئے ایک مجلسِ شوریٰ قائم کر دین، اور اگر ضرورت سمجھین تو امیر کو کلی یا جزوی طور پر اس مجلس شوریٰ کے مشورے کا پابند کر دین،

پس دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کی مذکورۂ بالا تقریر، اور اس سے جو کچھ وہ ثابت کرتا ہی، کتاب و سنت اور شریعت حقہ کی روشنی مین صحیح ہے یا نہین، اگر زید کے مذکورۂ بالا دعاوی صحیح نہین ہین تو کیون، اور پھر زید کی مندرجۂ ذیل باتون کا جواب کیا ہوگا:

(۱) اسلام ایک جمہوری نظام ہے، اور موجودہ رائج الوقت جمہوریت کی بنیاد بھی دراصل اسلام ہی کی رکھی ہوئی ہے، کیونکہ امیر کا انتخاب، اور اس کا عزل و نصب اسلام مین بھی جمہور مسلمین ہی کی راے پر موقوف ہی، یہ الگ بات ہی، کہ موجودہ زمانہ مین راے دہندگی کا معیار اور اس مین کامیابی کے طریقے غلط اور فاسد ہون، مگر یہ واقعہ ہے، کہ جمہور کی راے اور منشا کے مطابق ہی امیر کا منتخب ہونا اسلام مین ضروری ہے، پس جب کہ امیر کا انتخاب جمہور مسلمین کی اکثریت سے ہوگا، تو بتلایا جاے، کہ موجودہ زمانے مین اس کی کیا صورت ہوگی، کیا الیکشن سے یہ مرحلہ طے کیا جائے گا یا پھر کوئی اور صورت کتاب و سنت سے اسکی ہو سکے گی، اگر ہو سکے گی تو کیا،

(۲) اگر امیر کا انتخاب جمہور مسلمین کی اکثریت پر موقوف نہین ہے، اور محض اہلِ حل و عقد کی اکثریت امیر کو منتخب کرے گی، تو پھر سوال یہ ہے کہ اہلِ حل و عقد کون اور کس طرح منتخب کیا جائے گا، اور اہلِ حل و عقد کی تعیین کیسے ہوگی،

(۳) اگر امیر خود اہلِ حل و عقد کو منتخب کرے گا، تو بغیر اہلِ حل و عقد کے وجود مین آئے، امیر کا وجود ہی

کہان ہوگا، پھر یہ کس طرح معلوم ہو سکے گا، کہ یہ اہل حل وعقد عام مسلمانون کے معتمد علیہم اور ان کی مرضی کے مطابق ہین یا نہین،

(۴) جب کہ امیر کامل طور پر مختار ہو، اور اس کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو، نیز کوئی مجلس یا جماعت مسلمانون کے سیاسی نظام مین ایسی بھی نہ ہو، جو عام مسلمانون کی رضامندی اور اعتماد کو حاصل کر چکی ہو، نیز یہ کہ امیر کے مقابلے مین وہ جماعت کچھ اختیار رکھتی ہو، پس ان حالات مین جب کہ امیر کا نااہل ہونا ثابت ہو جائے، اور وہ کتاب و سنت کے خلاف چلنے لگے، اور مسلمانون کی فہمایش اور احتجاج سے بھی وہ باز نہ آئے، تو اس وقت اس کو معزول کرنے کا کوئی طریقہ کیا ایسا ہو سکتا ہے جس سے یہ مرحلہ آسانی اور امن وامان کے ساتھ طے ہو سکے' یا پھر اس سے صرف بغاوت، خروج، جنگ وجدل اور خونریزی ہی کے طریقے سے یہ کام انجام پا سکے گا، درآنحالیکہ یہ امر یقینی بھی نہین ہے کہ بغاوت و جنگ وجدل کا طریقہ اختیار کرنے سے بھی کامیابی ضروری ہو جائے، اور امیر کو معزول کر دیا جائے، بلکہ اوس کے برعکس اس کا زیادہ امکان ہے، کہ پھر امیر ہی کامیاب رہے، اور اس کے مخالفین مغلوب ہو جائین، کیونکہ بظاہر اس کے پاس قوت اور زور سلطنت ہوگا، چنانچہ اکثر ایسا ہی واقع ہوا ہے' جیسا کہ تاریخ دان حضرات سے یہ امر مخفی نہین ہے، کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانے مین بارہا خروج و بغاوت کی تحریک شروع ہوئی لیکن بالآخر اون کی سرکوبی کر دی گئی، پس کیا یہ قرین عقل ہے کہ ایسا نظام سلطنت کوئی معقول نظام سلطنت کہا جا سکتا ہے' اسی طرح اگر ارباب شوری اور اہل حل وعقد کو عام مسلمانون کا اعتماد حاصل نہ ہو یا کچھ دنون کے بعد ان پر سے اعتماد اٹھ جائے، لیکن امیر ان کو الگ نہ کرے تو پھر عام مسلمانون کے پاس وہ کونسا ذریعہ ہوگا، جس سے وہ اس مجلس کو بآسانی بدل سکین، زید اپنے استدلال کی تائید مین موجودہ تاریخ سے صرف ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہے، شمالی امریکہ جس کا دنیا مین اس قدر شور و غلغلہ ہے، ابتدا انگلستان کی نوآبادی تھی،

اٹھارہوین صدی کے وسط مین امریکہ نے جارج واشنگٹن کی سرکردگی مین جنگ کے بعد خود مختاری حاصل کی جو نظام حکومت اس وقت ریاستہائے متحدہ امریکہ مین جاری ہے وہ یہ ہے:-

(۱) امریکہ کا جمہور کثرت رائے سے امیر یا پریزیڈنٹ منتخب کرتا ہے،

(۲) اس پریزیڈنٹ کا انتخاب پانچ سال کے لئے ہوتا ہے لیکن ایک شخص پانچ سال تک پریزیڈنٹ رہنے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ بھی اس عہدہ کے لئے منتخب ہو سکتا ہے،

(۳) اگرچہ اس پریزیڈنٹ کو وسیع اختیارات حاصل ہین، مگر پھر بھی وہ اختیارات لامحدود نہین ہین،

(۴) امریکہ کا جمہور ایک مجلس شوری یا پارلیمنٹ اپنے مین سے منتخب کرتا ہے، اور ملک کے نظم و نسق کے متعلق لامحدود اختیارات جمہور کی طرف سے اس پارلیمنٹ کو حاصل ہوتے ہین، اور یہ پارلیمنٹ اور پریزیڈنٹ ملکر ملک کی سیاسی گاڑی کو چلاتے ہین، امریکہ کو خود مختار ہوے اور اس کا موجودہ نظام حکومت قائم ہوئے تقریباً ڈیڑھ سو (۱۵۰) سال سے کچھ اوپر ہوئے یعنی امریکہ ۱۷۸۳ء مین خود مختار ہوا، اس عرصہ مین اس امر کی نوبت نہین آئی کہ امریکہ کے کسی پریزیڈنٹ یا امیر نے اپنی اولاد مین سے کسی کو جانشین بنانے کی کوشش کی ہو، اور اس بنا پر پریزیڈنٹ اور پارلیمنٹ اور امریکہ کے جمہور مین کبھی جنگ وجدل کی نوبت آئی ہو، درانحالیکہ اسلامی تاریخ مین خلافت راشدہ کے شروع ہونے سے ۴۰ سال کے بعد ہی امیر معاویہ رضؓ کے زمانہ ہی مین مسلمانون کے امیر نے اپنی زندگی ہی مین اپنے بیٹے یزید کے نام مسلمانون سے بیعت حاصل کی، اور اپنے بعد یزید کو اپنا جانشین قرار دیا، اور اس کے بعد تو خلافت بالکل ہی ملوکیت مین بدل گئی، اور اُس وقت سے اب تک مسلمانون کو خلافت یا جمہوری نظام حکومت کی صورت دیکھنے کو نصیب نہین ہوئی، یہ یاد رہے کہ یہ خیر القرون کا زمانہ تھا، کیونکہ امیر معاویہ رضؓ خود صحابی تھے، اور ان کے زمانہ مین اور انکی وفات کے بعد بنی امیہ کے کئی خلفاء کے زمانہ تک جلیل القدر صحابی حیات تھے، تاہم مسلمانون کے نظام حکومت

مین ملوکیت کی لعنت پھیلنے سے نہین رُکی کیا کوئی صاحب فہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور کر سکتا ہے، کہ امریکہ کے جمہور مین امیر معاویہ اور اُن کے جانشینون کے زمانے کے مسلمان جمہور سے زیادہ للّٰہیت، زیادہ بے نفسی اور زیادہ ایثار ہے، کیونکہ امریکہ مین امریکہ کے کسی پریزیڈنٹ نے اپنی جگہ اپنی اولاد کو جانشین بنانیکی کوشش نہین کی، برخلاف اس کے مسلمانون کا امیر خلافت راشدہ کے شروع ہونے کے ۳۰ سال بعد ہی ایسا کرنے لگتا ہے، ظاہر ہے کہ کوئی ایسا باور نہین کر سکتا، نہ یہ واقعہ ہے، پھر بھی اگر مسلمانون کی خلافت ملوکیت مین بدل گئی، اور امریکہ کی جمہوریت جس حالت مین شروع ہوئی تھی، ابھی تک اسی حالت مین قائم ہے، اس کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے، تو صرف یہ کہ ہمارے نظام حکومت مین کوئی نقص تھا، جس کی وجہ سے ہماری خلافت ملوکیت مین تبدیل ہو گئی، اور وہ نقص سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے نظام حکومت مین (۱) امیر کا انتخاب غیر متعین مدت کیلئے کیا جاتا تھا (۲) امیر کے اختیارات پر کوئی پابندیان عائد نہین کیجاتی تھین (۳) مجلس شوریٰ امیر کی منتخب کردہ ہوتی تھی، اس کا کوئی خود مختار وجود نہین ہوتا تھا (۴) ہمارے نظام حکومت مین کوئی ایسی مشینری نہین تھی، جسکے ذریعہ سے کسی نا اہل امیر کو بلا جنگ و جدل کے معزول کیا جا سکے،

مذکورہ بالا معروضات پر توجہ فرما کر امید ہے کہ علمائے کرام اپنے فیصلہ سے جمہور مسلمین کو آگاہ فرمائین گے کہ آیا مسلمانون کے نظام حکومت مین جو ترمیمین زید نے اپنی مندرجہ بالا تقریر مین پیش کی ہین، وہ شرعاً جائز ہین یا نہین، اگر نہین جائز ہین، تو کتاب و سنت مین کونسی بات ہے، جو اُن کو ناجائز قرار دیتی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ کے حل کی اس وقت ضرورت ہی کیا ہے، تو مین عرض کرونگا کہ اسوقت تو اسکے حل کی خاص ضرورت ہے، ہر طرف تبدیلیان ہو رہی ہین، اگر مسلمانون کو ہندوستان مین یا اوس کے کسی خاص حصہ مین سیاسی اقتدار حاصل ہو، تو ظاہر ہے کہ اون کو کوئی نظام حکومت قائم کرنا ہوگا، اس لئے اس امر کا فیصلہ ہونا پہلے سے ضروری ہے، کہ کس قسم کا نظام حکومت شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے، اور کس قسم کا ناجائز، بینوا و توجروا، والسلام

وفیات

شمس العلماء عبدالرحمان شاطر مرحوم

دکن ٹائمز مدراس مین یہ پڑھکر بہت افسوس ہوا کہ مدراس کے مشہور و ممتاز فلسفی شاعر مولانا شاطر کا وسط اپریل سنہ ۱۹۴۳ء مین انتقال ہو گیا،

ارکاٹ احاطۂ مدراس مین اسلامی علم و تمدن کی فراموش شدہ تاریخ کا ایک ورق ہے، نواب ارکاٹ کا محل، ارکاٹ کے جنگی خاتمہ کے بعد خود شہر مدراس ہے، شمس العلماء عبدالرحمان شاطر اسی برج فلکی کے آفتاب تھے، عمر ستر کے قریب ہو گی، اردو عربی، فارسی اور انگریزی زبانون سے واقف تھے، نواب صاحب ارکاٹ کے سکریٹری بھی تھے، اور مدراس ہائیکورٹ مین مترجم بھی رہے تھے، گو وطن مدراس تھا، مگر سنہ ۱۹۰۱ء اور سنہ ۱۹۰۲ء اور سنہ ۱۹۰۳ء مین حیدرآباد دکن کی بزم علمی مین اس وقت کے شریک تھے، جب مولانا شبلی، مولانا شرر اور داغ اور گرامی حیدرآباد کی زینت تھے، وہ ان کی مجلسون مین شریک ہوتے تھے، اور ان سے اپنے ذوقِ ادب کی پرورش کرتے تھے، اور اسی زمانہ سے وہ مولینا کے قریب رہنے والون اور قریب سے جاننے والون مین تھے، اور ان کی وہی محبت تھی، جو حضرۃ الاستاذ کی وراثت مین مجھے ملی تھی،

عبدالرحمان مرحوم شاعر تھے، شاطر تخلص کرتے تھے، اشعار حکیمانہ اور فلسفیانہ کہتے تھے، قطعات، رباعیات اور قصائد موزون کرتے تھے، جدید سائنس اور فلسفہ کے مسائل کو اسلامی الٰہیات سے تطبیق دیتے تھے، زبان سخت تھی، اور مشکل الفاظ کے استعمال سے اُن کو پرہیز نہ تھا، ان کی سب سے مشہور فلسفیانہ نظم "اعجازِ عشق" ہے، جو ایک طویل رائیہ قصیدہ ہے، جس مین جدید و قدیم فلسفیانہ مسائل و آرا سے الٰہیات اسلامیہ کی تفسیر و تشریح

کی ہی، یہ نظم ۱۹۰۲ء مین لکھی گئی تھی، اور اُس زمانہ کے تمام اکابر ومشاہیر مولانا حالی ہولانا شبلی، مولانا نذیر احمد مولوی ذکاء اللہ خان، نواب عماد الملک، مولوی سید اکبر حسین، پروفیسر عبد الغفور شہباز، امجد علی اشہرؔ شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی، علی حیدر طباطبائی استاد گرامی وغیرہ نے بیحد توصیف وتحسین کی تھی، ان مین سے مولانا شبلی کی جامع ومانع ومختصر تقریظ بطور نمونہ حوالہ قلم ہی،

آپ کا قصیدہ مین نے دیکھا، اس سے پہلے آپ کی مختلف نظمین نظر افروز ہو ئی تھین، مین مدت سے آپ کی قادر الکلامی اور خوش فکری کا معترف ہون، آپ کے کلام مین فلسفیانہ خیالات جس خوبی اور برجستگی سے ادا ہوتے ہین، اس کی مثالین اردو مین کم ملتی ہین "۔

اعظم گڈھ ۲۱ مارچ ۱۹۰۵ء

معارف نومبر ۱۹۲۵ء مین مرحوم اور اون کے گھر کی شاعرانہ لیاقت وقابلیت کا ذکر بسلسلہ سفر مدراس کیا گیا تھا، اور اسی کے پس وپیش زمانہ مین (مثلاً اپریل ۱۹۳۰ء) ان کی کچھ نظمین بھی معارف مین نکلی ہین، مدراس مین مولانا ناطر جیسے اردو کے حکیم شاعر کا وجود اس زبان کی عالمگیری کی دلیل قاطع تھی، جس نے چالیس برس تک اس ملک کو اپنی خوش نوائیون سے مسرور ومحسوس رکھا، افسوس کہ سرزمین دکن کا یہ بلبل شیرین نواب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا،

"س"

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء مین مدراس میں سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے ان کو بیحد پسند کیا، یہ اس کتاب کا تیسرا اڈیشن ہی،

قیمت :- عہ

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

نغمات نور از جناب نور لودھیانوی، تقطیع بڑی ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۲، غیر مجلد ۱۰، پتہ :- جعفریہ بک ایجنسی نیض باغ لاہور،

جناب نور لدھیانوی پنجاب کے روشناس شعرا مین ہین، ان کے کلام کے بعض مجموعے اس سے پیشتر شائع ہو چکے ہین، نغمات نور تازہ مجموعہ ہی، اس مین قومی، مذہبی، تاریخی، رومانی وغیرہ مختلف واقعات تاثرات اور جذبات پر نظمین، بعض مشہور نظمون کی تضمینیں، سہرے، سلام، منقبت، رباعیات، قطعات وغیرہ مختلف اصناف سخن کے نمونے ہین، دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب نور نے ۱۹۱۲ء سے جب کہ انکی عمر کل دس سال کی تھی، شاعری شروع کی، اس اعتبار سے گویا وہ پیدائشی شاعر ہین، اور ان کی مشق سخن پر ایک تہائی صدی کی مدت گذر چکی ہی، ایک سے زیادہ دوادین کے مالک ہین، اس لحاظ سے ان کا کلام استادانہ نہ سہی، مگر کم از کم موٹی موٹی غلطیون سے تو پاک ہونا چاہئے تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہی کہ انھون نے محض اپنی طبع رسا اور فطری ذوق پر اعتماد کو کافی سمجھا، اور کسی صاحب نظر کی طرف رجوع نہین فرمایا، اس لئے ان کے کلام مین صحت اور پختگی نہ پیدا ہو سکی، چنانچہ نغمۂ نور مین جابجا مختلف قسم کی لفظی ومعنوی غلطیان موجود ہین، اور کلام مین اتنی ناہمواری ہے، کہ ایک نظم کا ایک بند بہت بلند ہے، اور دوسرا معلوم ہوتا ہی کہ دفعۃً نیچے گر پڑا، ان خامیون کو تفصیل کیساتھ دکھانے کی گنجائش نہین، چند موٹی موٹی مثالین حسب ذیل ہین، صاحب نظر اصحاب خط کشیدہ الفاظ اور فقرون پر غور فرمائین، ساجن کی لگن ہی مین تھا مگن، وہ پریم پجاری روزانہ (ص ۴۴) دستار وکرتہ ودر شہوار ورخت وجنس ص ۶۳ حضور اپنی اداؤن کو بھول جاؤ تم، ص ۱۶۹ ورد رکھو اے دل سدا نام رسول اللہ کا ص ۱۶۰، نہ کر مجھ سے انداز وناز محبت ص ۱۶۳،

فرزانے کو اے ساقیا دیوانہ بنا دے ۱۹۱، وہ ظلم بھی کرتے ہین تو پوچھے نہین جاتے ۲۱۲، تو نے نرالے سوز سے چھیڑی ہی جو تار ساز کی ۲۲۵، سر ناز مین کہا کہا کے جھکو لا ظالم ۲۳۴، مست ہے صحن چمن مین اب گلاب موتیا ۲۴۳، یون ہین سہرے کی زبان ذوق و شوق بیار ہین ۲۶۷، بنتے بنی ہین دلی الفت رہے حد سے سوا ۲۷۶، یا کہ فنون کو جگاتی ہو صبا جھنجھوڑ کر ۲۷۶، عقل کے طوطے اڑے لب پر لگی مہر سکوت ۲۸۷، انبیاؤن مین بھی اک نور تجز ختم رسل ۳۳۱، مرے اشعار گلدستے ہین گلدستون کے دستے ہین ۳۴۲، یہان آج اس کے نیچے بوند پانی کو ترستے ہین ۳۴۵، مجھکو خاتون قیامت (حضرت فاطمہؓ) نے کیا ہی پرورش ۳۵۲، بعض مصرعے ناموزون ہین مثلاً سہرا تو ہو گا دلیکن نہ بندھے گا سہرا ۲۷۱، غنچون پہ اور ہے کلیون پہ عالم نکھار کا ۳۰۲، خواہ مزدور بھی کوئی ہو کہ محتاج و فقیر ۲۲۹، بندہ پرور ہے تیری ہستی تو فائز المرام ۳۰۱، اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالین ہین، طرز ادا کی تو اتنی خامیان ہین کہ بہت سے اشعار تو کلام موزون کے علاوہ اور کسی حیثیت سے شاعری کے زمرہ مین نہین آتے، لیکن ان سب کی تفصیل کی گنجائش نہین، آج کل کے عجلت پسند شعرار کے کلام کا عموماً یہی حال ہی ضرورت ہو کہ نئے دور کے شعرا اپنی متاعِ افکار کو بازارِ نقد مین پیش کرنے سے پہلے کسی کامل العیار کو دکھا لیا کرین تاکہ کم از کم اس قسم کے اغلاط سے محفوظ رہین،

مقالات سید جمال الدین (افغانی) مترجمہ مولوی عبدالرحیم صاحب منشی فاضل تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت :- ۸؍ پتہ :- دفتر اخبار سرحد لاہور،

اسلامی ممالک کی بیداری مین سید جمال الدین افغانی کی کوششون کا جتنا حصہ ہی، وہ باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہین، اس سلسلہ مین انھون نے اپنے عربی اخبار العروۃ الوثقیٰ مین بڑے پرزور اور مفید مقالات لکھے تھے، ان کا ایک مجموعہ العروۃ الوثقیٰ کے نام سے چھپ چکا ہی اور غالباً بعض مقالون کا اردو مین ترجمہ بھی ہو چکا ہی، مولوی عبدالرحیم صاحب نے چند اور مقالون کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، مضامین کے شروع مین سید جمال الدین افغانی ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہٗ اور ان کے رفیق مرزا محمد باقر ایرانی کے مختصر سوانح بھی دیدیئے ہین، معلوم

ہوتا ہی، مترجم نے یہ حالات کسی عربی یا فارسی کتاب سے لئے ہین، اور اس کے اندازِ تحریر کو بجنسہٖ اردو مین نقل کر دیا ہی، جو اردو کے لئے بالکل نامانوس ہی، یہی نقص جا بجا مقالات کے ترجمہ مین بھی ہے، گو ان مقالات پر ایک زمانہ گذر چکا ہے، لیکن یہ ایسے موضوع پر ہین، کہ ان کا مطالعہ آج بھی مفید ہے،

بن باسی دیوی جناب اشرف صبوحی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۵۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۲؍ پتہ :- کتب خانہ علم و ادب، دہلی،

اس کتاب مین انسان کے دورِ وحشت کے حالات کو جب کہ وہ پہاڑ کے غارون اور جنگلون مین زندگی بسر کرتا تھا، اور جنگلی جانورون کے شکار پر اسکی زندگی کا مدار تھا، دکھایا گیا ہے، اور اسکی معاشرت، نظام اجتماعی، اور عقائد و رسوم وغیرہ کو نہایت دلچسپ پیرایہ مین پیش کیا گیا ہی، واقعات سب تاریخی اور اثری ہین، لیکن مصنف یا مترجم نے ان کو دلچسپ افسانہ بنا دیا ہی، مقدمہ سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ کتاب کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ یا اوس سے ماخوذ ہے، لیکن مترجم کے ذوقِ ادب اور حسنِ تصرف نے خیالات، زبان اور مصطلحات ہر لحاظ سے اوس کو اس طرح اپنا لیا ہے، کہ کتاب بالکل ہندوستانی مذاق کے قالب مین ڈھل گئی ہے، اور کہین سے اخذ و ترجمہ نہین معلوم ہوتی، یہ کتاب معلومات اور لطفِ زبان دونون حیثیتون سے پڑھنے کے لائق ہی،

دامنِ باغبان ڈاکٹر سید احمد صاحب بریلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- ۱۰؍ پتہ :- عصمت بک ڈپو، دہلی،

اردو مین افسانہ نگارون کی کمی نہین، لیکن ایسے کم ہین، جن کے پیش نظر نوجوانون کی دماغی اور ذہنی تفریح کے علاوہ کوئی مفید مقصد بھی ہوتا ہو، اردو زبان کے کہنہ مشق صاحبِ قلم جناب ڈاکٹر سید احمد صاحب کے افسانے اس سے مستثنیٰ ہین، ان کا کوئی افسانہ مفید اصلاحی، اخلاقی اور مذہبی درس و تعلیم سے خالی نہین ہوتا، دامنِ باغبان ان کے سات افسانون کا تازہ مجموعہ ہے، یہ تمام افسانے مذکورۂ بالا خصوصیات

کے حامل ہیں، اور ہر لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہیں،

دل کی باتین از جناب سید کاظم دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، پتہ :۔ منیجر صاحب کہکشان گلی شاہ تارا دہلی،

مرزا کاظم صاحب دہلوی بھی ممتاز افسانہ نگارون مین ہین، دل کی باتین ان کے تیرہ افسانون کا مجموعہ ہے، بیشتر افسانے رومانی، اور بعض اخلاقی ہین، خیالات ستھرے اور زبان پاکیزہ ہی،

احساس کمتری جناب شیر محمد صاحب اختر تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۵ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ر، پتہ :۔ مکتبہ اردو لاہور،

احساس کمتری یعنی INFERIORITY COMPL EX نہایت مہلک نفسیاتی مرض ہے، اسکا مریض عموماً زندگی کی جدوجہد کے ناقابل ہوتا ہے، اور اس کی زندگی ناکامی اور نامرادی مین گذرتی ہے، اس کے اسباب عموماً بچپن ہی سے پائے جاتے ہین، اور کبھی کبھی ناموافق حالات بھی یہ مرض پیدا کر دیتے ہین، اس کتاب مین نفسیاتی حیثیت سے اس مرض کے اسباب، اسکے علامات، نتائج اور اس کے علاج کی تدبیرین بتائی گئی ہین، رسالہ مفید اور دلچسپ ہی،

مثنوی عائشہ رض صدیقہ از جناب وقار واثقی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۴ر، پتہ :۔ عصمت بک ڈپو دہلی،

اس مثنوی مین حضرت عائشہ رض صدیقہ کے بچپن سے لیکر وفات تک کے اہم اور سبق آموز واقعات زندگی مثلاً آنحضرت صلعم کیساتھ نسبت، رخصتی تعلیم و تربیت، خانہ داری کی زندگی، طرز معاشرت، سوکنوں اور سوتیلی اولاد کیساتھ برتاؤ، واقعہ افک، وفات نبوی، خلفائے راشدین کے زمانہ کے واقعات، جنگ جمل اور حضرت علی رض سے صلح و صفائی وغیرہ کو آسان زبان مین نظم کیا گیا ہی واقعات سب مستند ہین، واقعہ نگاری مین شاعری کا پہلو سنبھالنا بہت مشکل ہی اسلئے اس نظم مین اس نقطۂ نظر سے بعض خامیاں رہ گئی ہین لیکن نظم مفید اور مسلمان بچون کے پڑھانے کے لائق ہی،

"م"